تدبّرِ قرآن

۳

آلِ عمران

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

مندرجہ ذیل پہلوؤں سے یہ سورہ سابق سورہ (بقرہ) سے نہایت گہرا ربط رکھتی ہے۔

۱۔ ان دونوں کا موضوع ایک ہی ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات۔ لوگوں پر عموماً اور اہل کتاب پر خصوصاً۔

۲۔ دونوں میں یکساں شرح و بسط کے ساتھ دین کی اصولی باتوں پر بحث ہوئی ہے۔

۳۔ دونوں کا قرآنی نام بھی ایک ہی ہے۔ یعنی الٓمٓ

۴۔ دونوں شکلاً بھی ایک ہی تنے سے پھوٹی ہوئی دو بڑی بڑی شاخوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو شمس و قمر سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ دونوں حشر کے دن دو بدلیوں کی صورت میں ظاہر ہوں گی۔ اہل بصیرت سمجھ سکتے ہیں کہ وصف اور تمثیل میں یہ اشتراک بغیر کسی گہری مناسبت کے نہیں ہو سکتا۔

۵۔ دونوں میں زوجین کی سی نسبت ہے۔ ایک میں جو بات مجمل بیان ہوئی ہے، دوسری میں اس کی تفصیل بیان ہو گئی ہے۔ اسی طرح ایک میں جو خلا رہ گیا ہے، دوسری نے اس کو پُر کر دیا ہے۔ گویا دونوں مل کر ایک اعلیٰ مقصد کو اس کی مکمل شکل میں نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

ب۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے امتیازی پہلو

لیکن اس اشتراک اور یکسانی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی کچھ الگ الگ خصوصیات بھی ہیں جو ان کو ایک دوسری سے ممتاز کرتی ہیں۔ مثلاً

بقرہ پر غور کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب اہل کتاب نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور یہ آہستہ آہستہ جڑ پکڑ رہا ہے لیکن حسد اور ضد کے باعث وہ اس کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ اس احساس نے ان کو شدید کشمکش میں ڈال دیا ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی مخالفت کے لیے تو اٹھ کھڑے ہوتے لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ مخالفت

کس عنوان سے کریں۔ جس کے منہ میں جو آیا اس نے وہ اگلنا شروع کر دیا۔ کسی نے کہا نبوت و رسالت کے لیے تو بنی اسرائیل کا گھرانا مخصوص رہا ہے، اس گھرانے سے باہر کسی کو نبوت کس طرح مل سکتی ہے، بعض نے کہا ہدایت کے لیے تو بس تورات کافی ہے اور جب اس کے حامل ہم موجود ہیں تو اب کسی نئی ہدایت کی ضرورت کہاں باقی رہی، اسی جھنجھلاہٹ میں بعضوں نے حضرت جبریلؑ تک کو مطعون کر ڈالا کہ یہ فرشتہ شروع سے ہمارا بیری ہے۔ کچھ لوگوں نے یہود و نصاریٰ کا ایک متحدہ محاذ بنا کر مخالفت کا یہ پہلو اختیار کیا کہ آسمانی ہدایت یا تو یہودیت کے اندر ہے یا نصرانیت کے اندر، جس کو ہدایت مطلوب ہو وہ ان میں سے کسی کو اختیار کرے، ان کے سوا آسمانی ہدایت حاصل ہونے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ ایک گروہ نے دھوکا بازی کی روش اختیار کی۔ اس نے مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا چاہا کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں، مسلمان ایمان کا اجارہ دار تنہا اپنے ہی کو نہ سمجھیں، خدا، آخرت اور اپنے پیغمبر کو تو ہم بھی مانتے ہیں، اس سے کیا فرق پیدا ہوا کہ ہم نئے مدعی نبوت کو نہیں مانتے۔ ان حالات میں یہ سورہ اتری۔ اس میں ایک طرف تو تفصیل کے ساتھ ان تمام اعتراضات کے جواب دیے گئے جو اہل کتاب کی طرف سے اٹھائے گئے، دوسری طرف نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی جو اعلیٰ سند خود ان کے صحیفوں میں موجود تھی، اس کو واضح کیا گیا اور تیسری طرف نبی امی کی رسالت سے دین حق کی جو تجدید و تکمیل ہوئی تھی اس کی طرف رہنمائی کی گئی۔ اس طرح یہ سورہ گویا دعوت ایمان و اثباتِ رسالت بھی ہے اور دعوتِ جہاد برائے آزادیٔ قبلہ و غزوہ بدر بھی۔

سورۂ آلِ عمران پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بقرہ کے کچھ عرصہ بعد اس دور میں نازل ہوئی ہے جب افق پر اسلام کے غلبہ اور اس کی صداقت کے آثار اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ اہل کتاب کے لیے اس کی علانیہ مخالفت کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس صورتِ حال نے اہل کتاب کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن یہ اسلام صرف اس کی زبانوں ہی تک رہا، اس کے دلوں میں نہیں گھسا۔ دوسرے گروہ نے اسلام تو نہیں قبول کیا لیکن اس نے مسلمانوں کے ساتھ مذہب کے معاملے میں ایک سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔ اس سمجھوتے کے لیے اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہر مذہب کے پیروؤں کے لیے ان کا اپنا دین حق ہے اس وجہ سے مسلمان ہم کو ہماری یہودیت و نصرانیت پر چھوڑ دیں اور ہم مسلمانوں کو ان کے اسلام پر۔ اس طرح دونوں اپنے اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے ایک ہی ملک میں ایک ساتھ امن کی زندگی بسر کر سکیں گے۔

---

[1] سورہ بقرہ کے شروع میں اس گروہ کی طرف اشارہ ہے لیکن اس وقت تک یہ گروہ پوری طرح سامنے نہیں آیا تھا۔ اس سورت میں یہ بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ اس گروہ کا نظریہ بعینہٖ وہی ہے جو آج وحدتِ ادیان کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔

اس طرح ان دونوں گروہوں کا رویہ اسلام کے ساتھ بدل تو گیا لیکن یہ تبدیلی دل کی تبدیلی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ سراسر مصلحت پرستی پر مبنی تھی۔ پہلے گروہ نے اسلام کا جو اظہار کیا تو محض مسلمانوں کی متوقع کامیابیوں میں حصہ بٹانے کے لیے۔ دوسرے نے صلح جویانہ پالیسی اختیار کی تو صرف متوقع خطرات سے اپنے کو محفوظ کرنے کے لیے۔

اسی اثنا میں احد کا معرکہ پیش آیا جس میں مسلمانوں ہی کی ایک جماعت کی بے تدبیری سے ان کو ایک عارضی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس واقعے کا اثر اہل کتاب کے مذکورہ دونوں گروہوں پر یہ ہوا کہ انھوں نے اسلام کے بارے میں اپنی پالیسی پھر تبدیل کر دی۔ جو گروہ محض دنیوی کامیابیوں کے لالچ میں اسلام کی صفوں میں آگھسا تھا جب اس نے دیکھا کہ اس راہ میں خطرات بھی پیش آسکتے ہیں تو اس نے اس خطرے کے سودے سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور اسلام کی اطاعت کا قلادہ اتار کر پھر اپنے کفر کی طرف پلٹ گیا۔ دوسرے گروہ نے جب دیکھا کہ اسلام کو زک بھی پہنچائی جا سکتی ہے تو اس نے سوچا کہ ہم نے جو اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کے ساتھ صلح جویانہ روش اختیار کر لی ہے، یہ غلط ہے، کیوں نہ ہم مخالف طاقتوں کو قوت پہنچا کر یہ کوشش کریں کہ ایک مرتبہ اسلام کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں، چنانچہ انھوں نے بھی کھلم کھلا اپنی دشمنی کا اعلان کر دیا۔

اس طرح یہ دونوں ہی گروہ کھلم کھلا اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کی راہ پر چل پڑے اور انھوں نے طرح طرح کی چالوں سے مسلمانوں کے ذہنوں میں شبہات و شکوک بھرنے شروع کیے تاکہ جس طرح وہ خود فرقوں اور گروہوں میں بٹ چکے ہیں اسی طرح مسلمان بھی اپنی وحدت و یکجہتی کھو کر پراگندہ ہو جائیں اور ان کی طاقت ختم ہو جائے۔ ان حالات نے تقاضا کیا کہ اہل کتاب اور مسلمانوں دونوں کے سامنے دین کی یہ حقیقت واضح کی جائے کہ اللہ کی طرف سے لوگوں کو کئی دین نہیں ملے ہیں بلکہ ایک ہی دین ملا ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اس دین میں تقسیم اور تجزیہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے کچھ حصے کو تو مانا جائے اور کچھ کو نہ مانا جائے بلکہ بیک وقت اس کے کل کو ماننا یا کل کو چھوڑنا ہے۔ اس دین کا مطالبہ ہر حالت میں اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری ہے، خواہ حالات نرم ہوں یا سخت اور خواہ راہ ہموار نظر آرہی ہو یا آزمائشوں اور فتنوں نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہوں، حق ہر حال حق ہے، وہ بعض حالات میں مخفی تو ہو جاتا ہے جس طرح چھلکے کے اندر مغز لیکن معدوم نہیں ہوتا۔ اس طرح کے حالات میں وہی لوگ ثابت قدم رہتے ہیں جن کے ایمان اور علم میں پختگی ہوتی ہے، جو حق سے بے خبر ہوتے ہیں ان کے قدم اکھڑ جاتے ہیں۔

غزوہ احد بھی اسی طرح کا ایک امتحان بن کر لوگوں کے سامنے آیا، جس طرح غزوہ بدر کی نوعیت ایک فرقان کی تھی جس نے حق اور باطل کو الگ الگ کر دیا اسی طرح غزوہ احد کی حیثیت ایک آیت

متشابہ کی تھی جس کے باطن میں حکمت تھی لیکن اس کا ظاہر کمزور لوگوں کے لیے آزمائش بن گیا چنانچہ اس نے پختہ فکر و پختہ ایمان مسلمانوں کو چھانٹ کر ان لوگوں سے بالکل الگ کر دیا جن کے دلوں میں کجی اور دماغوں میں فتنہ سوئی تھی۔

یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ اتری چنانچہ اس میں ان تمام خامیوں اور گمراہیوں پر تبصرہ ہے جو اس وقت نمایاں ہوئیں، عام اس سے کہ وہ مسلمانوں سے ظاہر ہوئیں یا اہل کتاب سے۔ اس میں اس شک اور تذبذب کی ضلالت بھی واضح کی گئی ہے جس میں اہل کتاب مبتلا تھے اور اس اختلاف اور عدم اطاعت کے انجام بد پر بھی تبصرہ ہے جس کا اظہار منافقوں اور کمزور قسم کے مسلمانوں کی طرف سے ہوا تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو ان تمام چالوں سے آگاہ کیا گیا ہے جو ان کو زک پہنچانے کے لیے ان کے دشمن چل رہے تھے اور احد کی شکست سے ان کو جو بد دلی ہوئی تھی اس کو نہایت مؤثر انداز میں دور کیا گیا۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ جس طرح سورۂ بقرہ سورہ بدر ہے اسی طرح یہ سورۂ آل عمران سورۂ احد ہے۔ مزید غور کیجیے تو یہ بات بھی واضح ہو گی کہ بقرہ میں ایمان کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور اس سورہ میں اسلام کی۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بقرہ میں اللہ کے آخری رسول پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور اس سورہ میں اسلامی نظام اور اللہ کی حکومت میں داخل ہونے کی دعوت ہے۔

ان دونوں سورتوں کے موضوع اور عمود سے متعلق یہ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ بقرہ میں ایمان کا پہلو نمایاں ہے اور اس سورہ میں اسلام کا۔ اس حقیقت کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ نمازوں میں کبھی کبھی ایک رکعت میں بقرہ میں سے آیت ایمان پڑھتے اور دوسری رکعت میں آلِ عمران میں سے آیت اسلام۔ یہ گویا ایک لطیف اشارہ ہوتا اس بات کی طرف کہ ان دونوں سورتوں میں موضوع اور مقصود کی حیثیت کن مضامین کو حاصل ہے۔ علاوہ ازیں بقرہ کا خاتمہ ایک ایسی آیت پر ہوا ہے جو ایمان کے باب میں ایک نہایت جامع آیت ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ الایۃ اور پھر اس کا خاتمہ کامل اطاعت الٰہی کے مضمون پر ہوا ہے تاکہ ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ایمان کا لازمی ثمرہ اسلام ہے، جہاں صحیح ایمان موجود ہو گا اس سے لازماً اسلام ظہور میں آئے گا۔ اس طرح بقرہ کے خاتمے کی آیت نے آل عمران کے ساتھ اس کے ربط کو خود واضح کر دیا۔

دوسرا پہلو ان دونوں کے درمیان امتیاز کا یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں زیادہ تر خطاب یہود سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کی حیثیت سے اصلی مقام انھی کو حاصل تھا۔ نصاریٰ کی حیثیت محض ایک ضمنی فرقے کی تھی، چنانچہ قرآن نے بقرہ میں ان سے خطاب کیا بھی ہے تو وہ سرسری نوعیت کا ہے۔ البتہ آلِ عمران میں ان سے براہ راست خطاب کیا ہے اور بحث کا زیادہ حصہ انھی سے متعلق ہے۔ سورہ کی تمہید بھی ایک

جامع نوعیت کی ہے جو یہود و نصاریٰ دونوں کے لیے موزوں ہے۔ پھر اس سے آگے جو مضمون شروع ہوا ہے وہ تدریجی طور پر نصاریٰ کی تردید میں نمایاں ہوتا گیا ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ بقرہ میں استدلال زیادہ تر ایسے امورِ فطرت سے ہے جو کفار اور اہلِ کتاب دونوں پر یکساں حجت ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف آلِ عمران میں زیادہ تر استدلال صفات الٰہی یا ایسے مسلمات سے ہے جو اہلِ کتاب کے ساتھ مخصوص ہیں۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ ان دونوں ہی سورتوں میں اہلِ کتاب کو سخت توبیخ فرمائی ہے لیکن اندازِ توبیخ دونوں میں الگ الگ ہے۔ بقرہ میں توبیخ براہ راست ہے برعکس اس کے آلِ عمران میں ان کو براہ راست خطاب کرنے کے بجائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ ان کو یہ یہ تہدیدات پہنچا دو۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام ہو جانے کے بعد یہ لوگ لائقِ خطاب نہیں رہے۔ اب خطاب کے اہل صرف پیغمبرؐ اور اہلِ ایمان ہی ہیں۔

ج۔ دونوں سورتوں کی تقدیم و تاخیر کے وجوہ

ان دونوں سورتوں کے موضوع، ان کے زمانہ نزول کی خصوصیات، ان کے اسلوب بیان کے امتیازات پر ہم نے یہ جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مضامین کے اشتراک کے باوجود ان دونوں میں نسبت اس نوعیت کی ہے کہ مصحف میں تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے ان کی یہی ترتیب ہونی چاہیئے تھی جو ہے۔ یہاں بقرہ کے آل عمران پر مقدم رکھنے کے مندرجہ ذیل وجوہ بالکل واضح ہیں۔

ایمان اسلام کی بنیاد ہے۔ جس طرح علم عمل کی بنیاد ہے۔

یہود، نصاریٰ سے اقدم ہیں اس وجہ سے ضروری ہوا کہ پہلے یہود پر حجت تمام کی جائے۔

دلائل فطرت سے استدلال، صفات الٰہی سے استدلال کے مقابل میں زیادہ واضح، زیادہ قدیم، زیادہ وسیع ہے اس وجہ سے قرآن نے پہلے اس کو استعمال کیا۔

علیٰ ہذا القیاس حضرت آدم اور حضرت ابراہیم علیہما السلام چونکہ انبیاء متقدمین میں سے ہیں اس وجہ سے یہ مناسب ہوا کہ پہلے ان کے عہد و میثاق کا حوالہ دیا جائے اور اس سے استدلال کیا جائے۔ چنانچہ بقرہ میں ان کے عہد کا حوالہ دیا۔ بعد کی سورہ میں دوسرے انبیا کے عہد کا ذکر ہوا۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ ترتیب میں سورتوں کی تقدیم و تاخیر صرف ان کی ظاہری بڑائی چھوٹائی پر مبنی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا تعلق معانی و مطالب سے ہے۔ معانی کی ترتیب کے لحاظ سے حکمت جس ترتیب کی مقتضی ہوتی ہے وہ ترتیب قرآن میں اختیار فرمائی گئی ہے۔ البتہ اگر کہیں معانی کے اعتبار سے دو سورتیں ایک ہی درجے اور ایک ہی مزاج

کی ہوئی ہوں تو ممکن ہے، وہاں مجرد طول و حجم کی بنا پر ایک کو دوسرے پر مقدم کر دیا گیا ہو۔ لیکن یہ بات محض قیاس کے حد تک صحیح قرار دی جا سکتی ہے، ورنہ ایسے مواقع میں بھی گمان یہی ہوتا ہے کہ کوئی گہری معنوی حکمت ایک کو دوسرے پر مقدم کرنے کا باعث ہوئی ہوگی اگرچہ وہ حکمت ہماری سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔

د۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اس کا تعلق سورہ کے موضوع، اس کے ظاہری نظام اور سابق سورہ کے ساتھ اس کے تعلق سے ہے۔ اب ہمیں چند باتیں اس کے اندرونی نظام اور اس کے مختلف اجزا کے باہمی ربط و تعلق کے بابت بھی کہنی ہیں۔

اس سورہ پر جو شخص بھی تامل کی نظر ڈالے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ یہ دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے نصف اول میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اثبات اور اہل کتاب خصوصاً نصاریٰ کی گمراہیوں کا بیان ہے اور اس کے دوسرے نصف میں مسلمانوں کو اہل کتاب کی ان گمراہ کن چالوں سے خبردار کیا گیا ہے جو وہ ان کو راہِ حق سے ہٹانے کے لیے اختیار کر رہے ہیں یا اختیار کرنے والے ہیں۔ ساتھ ہی ان کو اللہ کی رسی مضبوطی سے تھامے رہنے، اطاعت پر جمے رہنے، جہاد کرنے اور امتحان کے مواقع پر انتشار و اختلاف سے بچنے کی تاکید فرمائی کہ اسی طرح وہ اسلام کی پیروی کا صحیح حق ادا کر سکیں گے اور نرمی و سختی دونوں صورتوں میں اللہ کی اطاعت پر قائم رہ سکیں گے۔ اگر وہ ان باتوں کی خلاف ورزی کریں گے تو ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو موسیٰ علیہ السلام کی امت کا ہوا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کی نافرمانی کی تو چالیس سال تک صحرا ہی میں بھٹکتے رہ گئے۔

اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے نصف اول کی حیثیت تمہید کی ہے اور نصف ثانی کی حیثیت مقصود کی۔ اس روشنی میں پوری سورہ کی تلاوت کیجیے تو آیات کا باہمی نظم سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی اور اس تمہید سے اصلی مقصود یہی ہے۔ رہا آیات کا باہمی نظم اور اس کے معانی کی وضاحت تو یہ چیز اس وقت سامنے آئے گی جب ہم سورۂ بقرہ کی طرح اس کے اجزا کو بھی الگ الگ مجموعوں کی شکل میں لے کر ان کی تفسیر کریں گے۔ چنانچہ اب ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق کی رہنمائی میں اس سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔
وما توفیقی الا باللہ

۱؎ یہ تمہیدی بحث بیشتر استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے۔

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰن (۳)

مَدَنِيَّةٌ ــــــــــــــــ اٰیَاتُھَا ۲۰۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

آیات ۱-۶

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ ﴿۴﴾ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ﴿۵﴾ ھُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۶﴾

شروع خدائے رحمان ورحیم کے نام سے

ترجمہ آیات ۱-۶

یہ الٓمّٓ ہے۔ اللہ ہی معبود ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، زندہ اور قائم رکھنے والا۔ اس نے تم پر کتاب اتاری حق کے ساتھ مصداق اس کی جو اس کے آگے سے موجود ہے۔ اور اس نے تورات اور انجیل اتاری اس سے پہلے لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر۔ اور پھر فرقان اتارا۔ بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے۔ اللہ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں۔ وہی ہے جو تمہاری صورت گری کرتا ہے رحموں کے اندر جس طرح چاہتا ہے۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ، وہ غالب اور حکیم ہے۔

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ (۱) سورۂ بقرہ کی تفسیر میں حروف مقطعات پر ایک، جامع بحث ہم کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے اس باب میں استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر بھی پیش کر دیا ہے۔ اس کے سوا کوئی نئی چیز اس سلسلے میں ہمارے سامنے ایسی نہیں آئی جو یہاں قابل ذکر ہو۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (۲) اس آیت میں جو اسمائے حسنیٰ مذکور ہیں سب کی تحقیق گزر چکی ہے، بعض کی تفسیر سورۂ فاتحہ میں، بعض کی سورہ بقرہ میں۔

صفاتِ حیات و قیومیت کے اسرار و مقتضیات

یہ امر، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، ملحوظ رہے کہ اس سورہ میں استدلال بیشتر صفاتِ الٰہی سے ہے۔ صفاتِ الٰہی میں سب سے پہلے صفاتِ حیات و قیومیت کو لیا ہے۔ ان دونوں صفتوں کے اسرار و حقائق پر ہم آیت الکرسی کے اسرار و حقائق کے ضمن میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ان کا اعادہ باعثِ طوالت ہوگا۔ یہاں موقع کلام کی مناسبت سے ان صفات کا حوالہ کتابِ الٰہی کی ضرورت کے اثبات کے پہلو سے ہے۔ چنانچہ بعد کی آیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ایک زندہ خدا ہے تو ناگزیر ہے کہ وہ سب کچھ دیکھتا سنتا ہے، ہماری دعائیں، فریادیں اس تک پہنچتی ہیں ہمارے اعمال و افعال اس کی نظر میں ہیں۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ ہماری دعائیں اپنی حکمت کے مطابق قبول فرماتا ہے اور ہمارے اعمال پر وہ ایک دن جزا اور سزا بھی دے گا۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ بندے اپنی زندگی میں وہ رویہ اختیار کریں جو اسے پسند ہو۔ یہ چیز اس بات کی مقتضی ہے کہ بندوں میں اس بات کی جستجو ہو کہ کون سے اعمال خدا کو پسند ہیں، کون سے ناپسند، تاکہ وہ اس کی اطاعت و ہدایت کی راہ اختیار کر کے سعادت کا مقام حاصل کر سکیں اور حقیقی زندگی کے چشمہ حیواں سے فیضیاب ہو سکیں۔

اہل کتاب "خداوند خدا"، "زندہ خدا" کی تعبیر سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے انبیا کے صحیفوں میں بکثرت یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کے علم اور اس کی غیرت کا اظہار ہوا ہے بالعموم اس کے لیے "زندہ خداوند" ہی کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ نصاریٰ اگرچہ اپنے زعم کے مطابق ایک مصلوب خدا کی پرستش کرتے ہیں لیکن وہ بھی "زندہ خدا" کی تعبیر سے نا آشنا نہیں تھے۔ اس وجہ سے یہ بات بداہتہً ان کے خلاف جاتی ہے کہ ایک طرف تو وہ زندہ خدا کا تصور رکھتے ہیں اور دوسری طرف اس کا مصلوب ہونا بھی مانتے ہیں۔

اسی طرح "قیوم" کی صفت بھی انبیا کے صحیفوں میں بار بار مذکور ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اللہ ہی کے حکم اور اس کی قدرت سے

قائم ہے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی ان بدیہی صفات میں سے ہے جن پر عقلاً بھی ایمان لانا ضروری ہے اور انبیا کے صحیفوں کی رو سے بھی۔ نصاریٰ بھی ان صحیفوں پر ایمان کے مدعی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ حضرت مسیح کی الوہیت کے قائل ہیں۔ اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ جب تم خود اقرار کرتے ہو کہ حضرت مسیح بھوک پیاس محسوس کرتے تھے، غذا اور پانی کے محتاج تھے، بغیر ان چیزوں کے وہ اپنی ہستی کو قائم رکھنے پر قادر نہ تھے تو پھر وہ خدا کس طرح ہوئے، جب کہ خدا کے لیے تمھارے اپنے انبیا کے ارشاد کے بموجب قیوم ہونا ضروری ہے؛ یا یہ سوال کیا جائے کہ جب تمھاری اپنی انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح مصائب و شدائد پیش آنے پر روئے، ان کا دل تنگ ہوا اور سولی پر انھوں نے فریاد کی تو پھر وہ آسمان و زمین کے تھامنے والے اور قائم رکھنے والے کیسے ہو سکتے ہیں؛ تو ان سوالوں کے جواب میں ان کے پاس ضد اور کٹ حجتی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہاں قیوم کی صفت کا حوالہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ہمیں ہدایت بخشے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ واحد، ہمارا پروردگار، جس طرح ہمارا پیدا کرنے والا اور ہمیں زندگی بخشنے والا ہے اسی طرح وہ، جیسا کہ آیت الکرسی میں ارشاد ہوا، اپنی خلق کو قائم رکھنے والا بھی ہے اور اس کے لیے اس نے ہر قسم کے اسباب و وسائل پیدا کیے ہیں۔ پھر جب اس نے ہماری معیشت کے لیے یہ کچھ سامان کیے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی کے لیے وہ چیز نہ دے جو ہمارے قیام و بقا کی ضامن ہو سکے درآنحالیکہ یہ چیز ہماری خلقت کی اصل غایت ہے۔ چنانچہ یہی چیز قیام عدل و قسط کی اصل اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرائع و احکام کے نزول کی بنیاد بنی اس لیے کہ اس کے بغیر فطرتِ انسانی ارتقا کے اس درجے کو حاصل نہیں کر سکتی تھی جو اس کے وجود کے اندر مضمر ہے۔

یہ قیومیت اس بات کی بھی مقتضی ہوئی کہ خدائے قیوم و کارساز اس امر کی بھی نگرانی رکھے کہ جب بندے اپنی خود مختاری اور سرکشی سے کام لے کر اس کے نظام عدل کو بالکل مٹا دینے کی کوشش کریں تو وہ اپنے ایسے بندوں کو بھی اٹھاتا رہے جو اس کو از سر نو بحال کرنے کے لیے اپنی مساعی صرف کریں۔ چنانچہ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک اللہ تعالیٰ نے دنیا کو عدل و حق اور اپنی سیدھی راہ پر استوار رکھنے کے لیے اپنے بے شمار نبی اور رسول بھیجے اور خاتم الانبیا پر دین کی تکمیل کر دینے اور کتاب الٰہی کو ہر قسم کی دست اندازیوں سے محفوظ کر دینے کے بعد اس مقصد کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ ہر دور میں اس امت کے اندر ایک ایسا گروہ، خواہ وہ کتنا ہی قلیل التعداد ہو، پیدا ہوتا رہے گا جو خود حق و عدل پر قائم اور دوسروں کو اس عدل و حق کے قائم کرنے کی دعوت دیتا رہے گا۔ اس حقیقت کی وضاحت حدیثوں میں بھی ہوئی ہے اور اس کی طرف

بعض لطیف اشارات اس سورہ میں بھی آ رہے ہیں جن کی طرف ہم آگے انشاء اللہ موزوں مقامات میں توجہ دلائیں گے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۥ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۥ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۴)

قرآن کے اتارے جانے کی ضرورت

حق کے معنی کی تحقیق تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے مختلف معانی میں سے "قولِ فیصل" مراد ہے۔ یعنی وہ بات جو نزاع و اختلاف کا فیصلہ کر دے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جو کتاب دی گئی تھی اس میں انھوں نے اختلافات پیدا کر دیے جس کے سبب سے اصل حقیقت گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس گم شدہ حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن اتارا تاکہ لوگ اللہ کے اصل دین سے بہرہ مند ہوں اور اختلافات و نزاعات کی بھول بھلیاں سے نکل کر دین کی اصلی شاہراہ پر آ جائیں۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ' پر بھی تفصیلی بحث سورہ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ قرآن کے مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ہونے کے ایک مشہور معنی تو یہ ہیں کہ یہ بنیادی طور پر پچھلے صحیفوں کی تمام صحیح تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے، صرف ان باتوں کی تردید کرتا ہے جو ان میں ملاوٹ کرنے والوں کی طرف سے ملا دی گئی ہیں۔ قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں کی یہ ہم آہنگی و ہم رنگی اس بات کی صاف شہادت ہے کہ یہ سب ایک ہی آفتاب حق کی شعاعیں اور ایک ہی منبع انوار کے پرتو ہیں۔ دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ قرآن اور اس کے حامل کی صفات پچھلے صحیفوں کی پیشین گوئیوں میں مذکور ہیں۔ یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے مصداق کی منتظر تھیں، قرآن کے نزول اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ان کی تصدیق ہوئی۔ یہ قرآن کے حق ہونے کی ایک بہت بڑی شہادت ہے اور ساتھ ہی اس سے ان صحیفوں کی بھی تصدیق ہو رہی ہے کہ ان میں جو پیشین گوئیاں وارد تھیں وہ سچی ثابت ہوئیں۔ اس پہلو سے قرآن سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے خیر مقدم کا سزاوار تھا جو اگلے صحیفوں پر ایمان کے مدعی تھے کہ اصلاً قرآن کے ظہور سے سب سے زیادہ انھی کے سر اونچے ہوئے تھے، لیکن انھوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب سے اس کا انکار کیا۔

خلاصہ مطلب

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ الآیۃ۔ یہ اوپر والے ٹکڑے کے اجمال کی تفصیل ہے جس سے قرآن کے اتارے جانے کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہے اس وجہ سے اس نے ہماری زندگی کی رہنمائی اور ہمیں عدل و قسط پر استوار رکھنے کے لیے قرآن کو قولِ فیصل بنا کر اتارا ہے۔ اس سے پہلے اس نے لوگوں کی ہدایت

کے لیے تورات اور انجیل نازل فرمائیں لیکن ان کے پیروؤں نے ان میں تحریف اور ان کے بعض حصوں کو فراموش کر کے ان میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے جس کے سبب سے حق و باطل میں امتیاز ناممکن ہو گیا یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ قرآن کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنا کر اتارے۔ چنانچہ اس نے یہ کتاب نازل فرمائی اب جو لوگ اس کتاب کا انکار کریں گے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب ہے اس لیے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے اس نظامِ عدل و قسط کے دشمن ہیں جو اس کی مخلوق کی صلاح و فلاح اور اس کی دنیا و آخرت دونوں کی سعادت کے لیے ضروری ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو چھوڑ دے، ان کی عدل دشمنی کی ان کو سزا نہ دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اپنی دنیا کو تباہی کے لیے چھوڑ دیا اور اس کے بقا سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ درآنحالیکہ اس کی صفت، جیسا کہ اسی سورہ میں آگے ذکر آئے گا، قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ہے۔ اس قوامیت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اس قسط کے دشمنوں سے انتقام لے اور ان کو واجبی سزا دے۔ وہ عزیز یعنی غالب اور قدرت والا ہے، کمزور اور ناتوان نہیں ہے کہ کوئی اسے بے بس کر دے، اسی طرح وہ انتقام والا ہے یعنی عدل و قسط کے معاملے میں غیور ہے، سرد مہر اور بے احساس نہیں ہے کہ ان کی پامالی پر راضی ہو جائے۔ یہ اس کی انہی صفات کا ظہور ہے کہ جن قوموں نے اس کے قائم کردہ قسط کو مٹایا ہے، ایک خاص حد تک ان کو مہلت دینے کے بعد اس نے ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا ہے اور جب جب اس کے شرائع و احکام کو نابود کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس نے ان کو از سرِ نو تازہ کرنے اور سنوارنے کا اہتمام فرمایا ہے۔ عدل و قسط کے قیام و بقا کے لیے اپنی اسی سنت کو یہاں انتقام سے تعبیر فرمایا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (۵) هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶)

قیامِ عدل پر صفاتِ الٰہی سے استدلال

اوپر والی آیت میں کتابِ الٰہی کے مخالفین یا بالفاظِ دیگر عدل و قسط کے بادمین کے لیے جو سزا مذکور ہوئی ہے یہ اس کی دلیل ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدا کی اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر رہتا ہے۔ اس سے کوئی بات بھی مخفی نہیں رہتی، خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، اور خواہ زمین میں پیش آئے یا آسمانوں میں، خدا کا علم ہر چیز اور ہر جگہ کو محیط ہے اور محیط کیوں نہ ہو، اسی نے تو سب کو پیدا کیا اور وہی ہے جو رحموں کے اندر صورت گری فرماتا ہے تو جس نے پیدا کیا اور جس نے صورت گری فرمائی کیا وہ بھی بے خبر ہو سکتا ہے اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا جس نے پیدا کیا وہ بھی نہ جانے گا)

اس کے بعد توحید اور خدا کی صفات میں سے عزیز اور حکیم کا حوالہ دیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ محیطِ کل علم رکھنے والی ہستی اگر قیامِ عدل و قسط کا اہتمام نہ کرے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو عزت و قدرت حاصل نہیں ہے یا عزت و قدرت تو حاصل ہے لیکن اس کو اپنے کاموں میں کسی حکمت

مصلحت کی کوئی پروا نہیں، بس ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے، خیر ہو یا شر، ظلم ہو یا انصاف اس سے اسے کچھ بحث نہیں، دونوں ہی چیزیں اس کی نظر میں یکساں ہیں، یہ خیال بالبداہت باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی، اسے ہر چیز پر قدرت بھی حاصل ہے اور اس کے ہر کام میں عدل و حکمت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ ہر چیز سے باخبر بھی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں سے انتقام نہ لے گا جو اللہ کی اس کتاب کا انکار کریں گے جو اس نے دنیا میں از سر نو حق و عدل کے آثار و اعلام کو اجاگر کرنے کے لیے نازل فرمائی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۷-۱۷

قرآن کے نزول کی ضرورت واضح کرنے کے بعد اب یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جو اس قرآن کا انکار کر رہے ہیں اور وہ کیا چیزیں ہیں جن کو وہ اپنے اس انکار کے لیے بہانہ بنا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں فرمایا ہے کہ انکار کی راہ ان لوگوں نے اختیار کی ہے جن کے دلوں میں کجی اور جن کی طبیعتوں میں فتنہ پسندی ہے۔ اپنے اس ذوق کی وجہ سے وہ قرآن کی اصل تعلیمات سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ وہ اس میں صرف ایسی چیزیں ڈھونڈھتے ہیں جن کی آڑ لے کر وہ قرآن کے خلاف لوگوں کے دلوں میں کچھ شبہات و شکوک پیدا کر سکیں اور اس طرح خود بھی راہ حق سے گریز اختیار کریں اور جس حد تک ان کا زور چلے دوسروں کو بھی اس سے بدکائیں۔ چنانچہ ان کی ساری دلچسپی محکمات کے بجائے صرف متشابہات سے ہوتی ہے اس لیے کہ ان کا تعلق آخرت کی زندگی کی تمثیلات و تشبیہات سے ہوتا ہے، ان کے اندر موشگافی اور کرید کر کے کوئی ایسی بات نکالی جا سکتی ہے جو خود ان کی ضلالت کے لیے بھی ایک بہانہ بن سکے اور دوسروں کو بھی اس سے فتنے میں مبتلا کیا جا سکے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جن کے اندر علم و عقل کی پختگی موجود ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی آیات کی قدر کرتے ہیں اور اس کی تعلیمات و ہدایات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ قرآن کے محکمات کی طرح اس کے متشابہات کی بھی قدر کرتے ہیں اور ان کو اعتراض و فتنہ جوئی کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو اضافۂ علم کا ذریعہ بناتے اور ان پر صدق دل سے ایمان لاتے ہیں۔ اگر کوئی بات اپنی فہم کی گرفت سے ماورا پاتے ہیں تو اس کی حقیقت و ماہیت کے درپے ہونے اور اس کو فتنہ بنانے کے بجائے اس کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں کہ یہی رویہ علم و ایمان کی پختگی کا مقتضیٰ ہے۔ نیز ان کے اندر آخرت کا پختہ یقین ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ شیاطین کی وسوسہ اندازیوں سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے برابر دعا بھی کرتے رہتے ہیں کہ ایمان کی دولت سے بہرہ یاب فرمانے کے بعد وہ ان کو کسی گمراہی میں پڑنے سے محفوظ رکھے۔

اس کے بعد گمراہی کے ان اسباب کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کے پچھلے ہم مشربوں کی تباہی کے باعث ہوئے اور ساتھ ہی مسلمانوں کی کامیابی کے بعض تازہ واقعات کا حوالہ دے کر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اگر ان واقعات سے انھوں نے عبرت نہ پکڑی تو ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو پچھلوں کا ہو چکا ہے۔

اس کے بعد ان حجابات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کے اور قرآن کے درمیان آج حائل ہیں اور ساتھ ہی ان کی بے حقیقتی اور بے ثباتی کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ دنیائے فانی کی جن چیزوں پر ریجھ کر قرآن سے منہ موڑ رہے ہو ان کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ان کے پیچھے بھاگنے کے بجائے ابدی زندگی کی نعمتوں اور خدا کی خوشنودی کے طالب بنو جس کی راہ صبر، سچائی، اطاعتِ الٰہی، انفاق فی سبیل اللہ اور استغفار سے کھلتی ہے اور قرآن اسی راہ کی طرف بلانے کے لیے نازل ہوا ہے۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷-۱۷

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم — وقف منزل — وقف لازم — ع ۹

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾ قُلْ
لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ
الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِىْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ
فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ
الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ
لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ
النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ
وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ
مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ
اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ
اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ
وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

ترجمہ آیات ۷-۱۰

وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری جس میں محکم آیات ہیں جو اصل کتاب
کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری کچھ آیتیں اس میں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔ تو جن کے دلوں
میں کجی ہے وہ اس میں سے متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان
کی حقیقت و ماہیت معلوم کریں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تو

جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہیں۔ اور یاددہانی تو اہلِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت بخشنے کے بعد کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش۔ تو نہایت بخشنے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! تو سب لوگوں کو ایک ایسے دن کے لیے جمع کرکے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ ۷-۹

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، نہ ان کے مال خدا کے ہاں کچھ کام آئیں گے، نہ ان کی اولاد۔ اور وہی لوگ دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔ ان کا بھی وہی حال ہونا ہے جو آلِ فرعون اور ان لوگوں کا ہوا جو ان سے پہلے گزرے۔ انھوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا اور اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۱۰-۱۱

ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا ہے یہ کہہ دو کہ تم مغلوب ہوگے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ جن دو گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی ان کی سرگزشت میں تمھارے لیے نشانی ہے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، دوسرا کافر تھا، یہ ان کو کھلم کھلا ان سے دوگنے دیکھتے تھے اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی تائید سے مدد فرماتا ہے۔ اس میں آنکھیں رکھنے والوں کے لیے بصیرت ہے۔ ۱۲-۱۳

لوگوں کی نگاہوں میں مرغوباتِ دنیا عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، چوپائے اور کھیتی کھبا دی گئی ہیں۔ یہ دنیوی زندگی کے سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ ان سے کہو، کیا میں تمھیں ان چیزوں سے بہتر چیز کا پتہ

بدوں ؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہوگی۔ اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے۔ جو یہ دعا کرتے رہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے پس تو ہمارے گناہوں کو بخش اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ جو صابر، راستباز، فرمانبردار، راہِ خدا میں خرچ کرنے والے اور اوقاتِ سحر میں مغفرت چاہنے والے ہیں۔ ۱۷-۱۴

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هُوَ الَّذِيٓ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۷)

هُوَ الَّذِيٓ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ (وہی خدا ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری) سے اشارہ اس عزیز و حکیم اور حی و قیوم خدا کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور اس سے مقصود یہاں مخاطب کو کئی چیزوں کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

ایک تو اس عظیم رحمت کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اس کتاب کی شکل میں ظہور میں آئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات حیات و قیومیت کا ظہور ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو زندگی جاوداں سے بہرہ مند اور ان کو جادۂ حق پر استوار کرنے کے لیے یہ کتاب اتاری ہے۔ اس عظیم نعمت کا حق یہ ہے کہ بندے اس کی قدر پہچانیں، اس پر ایمان لائیں اور اس کے ذریعے سے حیاتِ جاوداں اور بقائے دوام حاصل کریں۔

دوسرے اس میں ان لوگوں کے لیے تخویف و تہدید کا پہلو بھی ہے جو اس کی تردید و تکذیب کریں گے اس لیے کہ جس خدا نے یہ کتاب اتاری ہے وہ عزیز بھی ہے اور قیوم بھی۔ اس کی اس عزت و حکمت اور اس قیومیت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا دے جو اس کے قانونِ حق و عدل کی راہ میں مزاحم ہوں۔

تیسرے اس سے نفس کتاب کے مزاج کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ ایک خدائے عزیز و حکیم کا کلام ہے اس وجہ سے یہ خود بھی عزیز و حکیم ہے۔ چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ اس کی صفت عزیز و حکیم آئی بھی ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب الجھنے اور موشگافی کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ بقدر ظرف و توفیق فائدہ اٹھانے کے لیے ہے۔ آدمی اس ناپیداکنار سمندر کی حکمتوں سے جو فائدہ اٹھا سکے اٹھالے، یہ توقع نہ کرے کہ وہ اس کے تمام اسرار و حقائق کا احاطہ کر سکتا ہے۔ اس کی جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں ان کو فتنہ اور شبہات و شکوک کا ذریعہ نہ بنائے بلکہ ان کو اللہ کے حوالہ کرے۔

اس آیت میں چند الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جن کی نوعیت کچھ قرآنی اصطلاحات کی سی ہے۔ چونکہ آیت کا ٹھیک ٹھیک مفہوم اس وقت تک واضح نہیں ہو سکے گا جب تک ان اصطلاحات کا مفہوم اچھی طرح واضح نہ ہو جائے اس وجہ سے پہلے ہم ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

'آیاتِ محکمات' سے مراد

اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ: آیات محکمات سے مراد قرآن کی وہ آیات ہیں جو آفاق و انفس کی بالکل بدیہیات، خیر و شر کے مسلمات، اور معروف و منکر کے قطعیات و یقینیات پر مشتمل ہیں۔ جن کو دل قبول کرتے ہیں اور جن کو قبول کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہے کہ دل سلیم ہو۔ جن کے حق میں ہر عقل گواہی دیتی ہے بشرطیکہ اس پر تعصب، جذبات اور غیر فطری عقلیات کے پردے پڑے ہوئے نہ ہوں۔ انھی محکمات پر ہر صحیح مذہب کی بنیاد ہوتی ہے اس وجہ سے تمام آسمانی مذاہب اور تمام انبیا سے یہ تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہیں۔ چونکہ فطرت انسانی کے اندر ان کی جڑیں نہایت مستحکم ہوتی ہیں، شبہات و شکوک کی آندھیاں ان کو ہلانے سے قاصر رہتی ہیں اس وجہ سے قرآن نے ان کو محکمات سے تعبیر کیا ہے۔

'اُمّ الکتاب' کا مفہوم

اُمُّ الْکِتٰبِ: آیات محکمات کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ ان کی حیثیت ام الکتاب کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بقیہ ساری کتاب کا مرجع و مرکز وہی محکمات ہوتی ہیں، انھی پر ساری بحث کا مدار ہوتا ہے، ساری شاخیں انھی سے پھوٹتی ہیں۔ اگر کوئی نزاع و اختلاف پیدا ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ بھی انھی کی کسوٹی پر پرکھ کر ہوتا ہے۔ پھر انھی کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ ان کو اصول قرار دے کر ان سے مسائل مستنبط کیے جائیں اور ان مسائل پر اسی طرح اعتماد کیا جائے جس طرح اصولوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

'آیاتِ متشابہات' سے مراد

مُتَشٰبِهٰتٌ: متشابہات سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں ہمارے مشاہدات و معلومات کے دائرہ سے باہر کی باتیں تمثیلی و تشبیہی رنگ میں قرآن نے بتائی ہیں۔ یہ باتیں جس بنیادی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں وہ بجائے خود واضح اور مُبرہن ہوتی ہے، عقل اس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے جتنا سمجھنا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ البتہ چونکہ اس کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن ان کو تمثیل و تشبیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ علم کے طالب بقدر استعداد ان سے فائدہ اٹھائیں اور ان کی اصل صورت و حقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کریں۔ یہ باتیں خدا کی صفات و افعال یا آخرت کی نعمتوں

اور اس کے آلام سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں، ان کا جس حد تک ہمارے لیے سمجھنا ضروری ہے اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور اس سے ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اگر ہم اپنی حد سے آگے بڑھ کر ان کی اصل حقیقت اور صورت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کریں تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے اور اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے ذہن سے شک کا ایک کانٹا نکالنا چاہتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے شمار کانٹے اس کے اندر چبھا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نایافتہ کی طلب میں اپنی یافتہ دولت کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے اور نہایت واضح حقائق کی اس لیے تکذیب کر دیتا ہے کہ ان کی شکل و صورت ابھی اس کے سامنے نمایاں نہیں ہوئی۔ قرآن نے اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ (بلکہ انھوں نے اس چیز کو جھٹلایا جو ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور ابھی تک اس کی حقیقت ان کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی ہے) یونس۔ ۳۹۔

متشابہات کی بعض مثالیں

ہم یہاں قرآن سے اس قسم کے بعض متشابہات کی مثالیں نقل کرتے ہیں۔ سورۂ مدثر میں قرآن نے دوزخ کے عذاب کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا	میں اس کو دوزخ میں داخل کروں گا اور تمھیں کیا پتہ کہ
سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ	دوزخ کیا ہے؟ وہ نہ ذرا ترس کھائے گی اور نہ کسی چیز
لِّلْبَشَرِ ۝ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝	کو چھوڑے گی، جسموں کو جھلس دینے والی ہو گی، اس پر
(۲۶ تا ۳۰)	خدا کے انیس سرہنگ مقرر ہوں گے۔

اس آیت میں جس سزا کا ذکر ہے وہ ایک حقیقت ہے اور قانون مجازات پر جس کا ایمان ہو اس کے لیے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، رہی اس کی تفصیل تو اس کا تعلق چونکہ ایک نادیدہ عالم سے ہے اس وجہ سے اس کی اصل صورت کسی طرح ہماری گرفت میں نہیں آسکتی۔ اس طرح کے معاملات میں صحیح روش یہ ہے کہ آدمی اتنے پر قناعت کرے جو سمجھ میں آتا ہے۔ جو سمجھ میں نہیں آتا وہ اس عالم میں سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا، اس وجہ سے اس کے درپے ہونے کے بجائے اس کو خدا کے حوالے کرے۔ سلیم الطبع انسان ایسا ہی کرتے ہیں لیکن جن کے دلوں میں کجی اور عقلوں میں ٹیڑھ ہوتی ہے وہ یہ روش اختیار کرنے کے بجائے متشابہات و تمثیلات کی حقیقت معلوم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں جس سے وہ خود بھی فتنوں میں پڑتے ہیں اور اپنے جیسے دوسرے بہتوں کو بھی فتنوں میں ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے مذکورہ بالا آیت میں تِسْعَةَ عَشَرَ کا جو لفظ آیا تو قرآن نے اس کے متعلق شرارت پسندوں کا ردِ عمل یہ بتایا ہے کہ وہ اسی کے درپے ہو گئے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے فرشتے مراد ہیں تو یہ سوال انھوں نے اٹھایا کہ انیس کے عدد کی تخصیص میں کیا رمز ہے؟ قرآن نے ان کے اس ردِ عمل پر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا۔

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا	اور ہم نے دوزخ کی پہرہ داری پر نہیں مقرر کیے ہیں مگر

مَلٰٓئِكَةً ۪ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝ (المدثر ۔۷۴ : ۳۱)

فرشتے، اور ہم نے ان کی تعداد کو نہیں بنایا مگر کافروں کے لیے فتنہ، تاکہ وہ لوگ یقین کریں جن کو کتاب ملی ہے اور ایمان والے اپنے ایمان میں اضافہ کریں اور کتاب پانے والے اور اہلِ ایمان شک میں نہ پڑیں اور جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو کافر ہیں وہ یہ کہیں کہ اس قسم کی تمثیل سے اللہ تعالیٰ کا کیا مطلب ہے؟ اسی طرح اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور یہ نہیں ہے مگر انسانوں کے لیے یاددہانی۔

اسی طرح سورہ بقرہ میں جنت کی نعمتوں کا تمثیلی رنگ میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب اہلِ جنت کے سامنے جنت کی نعمتیں پیش کی جائیں گی تو وہ خوشی سے پکار اٹھیں گے کہ یہ تو وہی نعمتیں ہیں جن کی ہمیں پہلے قرآن میں سیر کرادی گئی تھی، قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ (البقرۃ ۔ ۲۵) (وہ پکاریں گے، یہ تو وہی چیز ہے جو ہمیں اس سے پہلے بخشی گئی اور وہ دیے جائیں گے اس سے ملتی جلتی) یعنی جنت کی نعمتوں کا ذکر جو تمثیلات و متشابہات کے رنگ میں قرآن میں ہوا ہے اس سے اہلِ ایمان کو تو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بیٹھے ہوئے ایک سیر جنت کی کر لیتے ہیں لیکن انہی تمثیلات و متشابہات سے متعلق فتنہ جوؤں اور ضلالت پسندوں کے رویہ کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ (البقرۃ ۔ ۲ : ۲۶)

اللہ اس بات سے نہیں جھجکتا کہ کوئی تمثیل بیان کرے خواہ وہ کسی مچھر کی ہو یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی، تو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ یہ حق ہے اور ان کے پروردگار ہی کی جانب سے ہے لیکن جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی تمثیلیں پیش کرنے سے اللہ تعالیٰ نے کیا چاہا؟ اللہ ان تمثیلوں سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور ان سے بہتوں کو راہ یاب کرتا ہے اور ان سے نہیں گمراہ کرتا مگر انھیں لوگوں کو جو خدا کی نافرمانی کرنے والے ہوں۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آیات متشابہات سے مراد قرآن کی وہ آیتیں ہیں جن میں یا تو

آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت و نقمت کا بیان تمثیلی و تشبیہی رنگ میں ہوا ہے یا خدا کی صفات و افعال میں سے کوئی بات تمثیلی اسلوب میں پیش ہوئی ہے۔ مثلاً آدم میں خدا کا اپنی رُوح پھونکنا یا حضرت عیسیٰ کو بن باپ کے پیدا کرنا وغیرہ۔ اس طرح کی آیات سے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اہل ایمان کے علم و ایمان میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جن کی طبیعتوں میں فتنہ پسندی ہوتی ہے وہ انھی کے اندر موشگافیاں کر کے بہت سے فتنے پیدا کر لیتے ہیں۔

تاویل کا مفہوم

تاویل:۔ تاویل کا لفظ بھی اس آیت میں ذرا ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے یہاں مراد مذکورہ بالا قسم کی کسی بیان کردہ شے کی حقیقت اور اس کی صورت ہے۔ جس مفہوم میں یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے اسی مفہوم میں سورۂ یوسف میں استعمال ہوا ہے۔ قَالَ یٰۤاَبَتِ ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَھَا رَبِّیْ حَقًّا، (اس نے کہا اے میرے باپ، یہ ہے میرے اس خواب کی حقیقت جو میں نے اس سے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اس کو واقعہ ثابت کر دکھایا) (یوسف۔ ۱۰۰)

محکمات و متشابہات کے بارے میں چند تنبیہات

یہاں چند باتیں بطور تنبیہ اور بھی قابل ذکر ہیں۔ ان سے اس راہ کی ساری الجھنیں انشاء اللہ دور ہو جائیں گی۔

ایک یہ کہ اس آیت میں اسلوب کلام حصر کا نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں گمان کرنا چاہیے کہ بس قرآن کی آیات دو ہی قسموں، محکمات اور متشابہات، ہی میں تقسیم ہیں۔ یہاں صرف انھی دونوں قسموں کا ذکر دو متقابل قسموں کی حیثیت سے ہوا ہے اور مقصود ان کے ذکر سے محض فتنہ پسندوں اور ہدایت پسندوں کے اختلافِ ذوق کو نمایاں کرنا ہے کہ جو طبیعتیں فتنہ پسند ہوں ان کی ساری دلچسپی صرف متشابہات سے ہوتی ہے تاکہ ان کے ذوقِ فتنہ جوئی کے لیے کوئی غذا فراہم ہو سکے۔ برعکس اس کے جو علم و معرفت کے طالب ہوتے ہیں اور جن پر حقیقت پسندی کا رنگ غالب ہوتا ہے ان کی اصلی دلچسپی محکمات سے ہوتی ہے۔ جہاں تک متشابہات کا تعلق ہے ان کا جتنا حصہ ان کی سمجھ میں آتا ہے اس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، جو حصہ سمجھ میں نہیں آتا اس کی صورت و ہیئت معلوم کرنے کے پیچھے نہیں پڑتے بلکہ اس کو خدا کے حوالے کرتے ہیں۔ محکمات کی بدولت چونکہ ان کے قدم علم میں بہت راسخ ہو جاتے ہیں اس وجہ سے اس طرح کی چیزیں ان کو متزلزل نہیں کرتیں۔ قرآن میں ان دو قسموں کے علاوہ بھی آیات ہیں لیکن مقصود یہاں چونکہ آیاتِ قرآنی کی تمام انواع کا احاطہ نہیں ہے اس وجہ سے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ مثلاً قصص قرآن، امثال قرآن، تلمیحات و اشارات۔ یہ چیزیں نہ تو اُمّ الکتاب کے درجے اور مرتبے کی ہیں اور نہ ان کو ان متشابہات کے درجے میں رکھنا صحیح ہے جن کی تاویل میں غور و فکر کرنا ممنوع ہو۔

دوسری یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن کی آیات کا محکم و متشابہ ہونا ہرگز بلحاظ الفاظ نہیں ہے بلکہ صرف بلحاظ معنی ہے۔ قرآن، اپنے الفاظ اور اپنی زبان کے اعتبار سے، تمام تر عربی مبین میں ہے الفاظ

کی تاویل میں جو اختلافات ہوئے ہیں وہ بالعموم تین اسباب سے ہوئے ہیں۔ یا تو غور و تحقیق میں کوتاہی ہوئی ہے یا کسی غلط عقیدے کی بے جا عصبیت اس کا باعث ہوئی ہے، یا عربی زبان سے ناواقفیت اس کا سبب بنی ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس طرح کے کسی سبب سے کوئی الجھن پیدا ہوتی ہو تو اس پر غور و فکر عربی زبان کے معروف و مسلّم قواعد و ضوابط کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ یہ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن پر غور و فکر ممنوع ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ متشابہات ہوں یا محکمات، قرآن میں یہ دونوں قسمیں ممیّز اور معلوم ہیں۔ یہ بات نہیں ہے، جیسا کہ بعض متکلمین نے گمان کیا ہے کہ یہ دونوں غیر ممیّز ہیں اور نہ یہ بات ہے کہ الفاظ کی اپنے معانی پر دلالت کوئی مشتبہ اور مشکوک چیز ہے۔ جن لوگوں نے ایسا سمجھا ہے انھوں نے بالکل غلط سمجھا ہے۔ ان میں سے پہلی بات تو صریحاً غلط ہے اور دوسری بات نہایت مبہم ہے جو سرے سے قرآن ہی سے مایوس کر دینے والی ہے حالانکہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے نور و برہان بنا کر اتارا ہے۔ جو باتیں عالمِ غیب سے تعلق رکھنے والی ہیں ان کے متعلق خدا نے ہماری ضرورت کے حد تک خبر دے دی ہے، اس کا جو حصہ ہم سے محجوب رکھا گیا ہے بس اس کی تاویل پردۂ خفا میں ہے۔

چوتھی یہ کہ قرآن نے یہاں محکم اور متشابہ کا ایک خاص مفہوم مراد لیا ہے جو ان کے لغوی مفہوم سے ایک حد تک الگ ہے۔ بعض دوسرے مقامات میں بھی قرآن میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں جہاں ان کے لغوی مفہوم مراد ہیں۔ مثلاً محکم سے مراد وہ کلام ہے جو جامع، واضح اور موجز ہو۔ اس صورت میں اس کا مقابل لفظ مفصّل آتا ہے۔ مثلاً کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (ھود-۱) (یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں، پھر ان کی تفصیل کی گئی خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے) سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ شروع شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیمات و ہدایات قولِ محکم کی شکل میں اتاریں تاکہ وہ ذہن و حافظے میں اچھی طرح راسخ ہو سکیں اور دل اور زبان دونوں کے لیے وہ ہلکی پھلکی محسوس ہوں پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ذریعے سے ان کی تفصیل فرما دی۔ اسی طرح متشابہ کا ایک عام مفہوم بھی ہے وہ یہ کہ ایک دوسری سے ملتی جلتی ہم آہنگ وہم رنگ چیز۔ اپنے اس مفہوم کے اعتبار سے پورا قرآن متشابہ ہے۔ چنانچہ اسی پہلو سے قرآن کو متشابہ کہا گیا ہے۔ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ (زمر-۲۳)

پانچویں یہ کہ جس طرح قرآن محکمات و متشابہات دونوں ہی قسم کی آیات پر مشتمل ہے اسی طرح عالمِ انفس اور عالمِ آفاق میں جو نشانیاں ہیں وہ بھی محکمات و متشابہات دونوں ہی پر مشتمل ہیں۔ ان کے باب میں بھی اربابِ علم اور اہلِ زیغ کا رویہ وہی ہوتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ جن کے ذہن و فکر میں پختگی ہوتی ہے وہ محکمات سے اطمینان و یقین حاصل کرتے ہیں اور متشابہات سے شبہات و شکوک میں گرفتار ہونے کے

بجائے ان کو خدا کے علم و حکمت کے حوالے کرتے ہیں اور اپنے علم کی کوتاہی کا اقرار کرتے ہیں، برعکس اس کے جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ ان متشابہات کو اپنی اور دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس مسئلے پر مفصل بحث انشاء اللہ ہم سورۂ کہف کی تفسیر میں کریں گے۔ غزوۂ اُحد کے واقعہ کو بھی، جیسا کہ ہم تمہیدی بحث میں اشارہ کر چکے ہیں، ایک متشابہ واقعہ کی نوعیت حاصل ہے، چنانچہ اس جنگ کے بعد اس عظیم آیت کا اترنا اس کائنات کی ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لیے تھا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس طرح غزوۂ بدر حق و باطل کے درمیان ایک یوم فرقان تھا جس سے اہل ایمان کے قلوب اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر مطمئن ہوئے اور اس نے ایک آیت محکم بن کر اہل کفر پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری کر دی اسی طرح غزوۂ احد کی حیثیت ایک آیت متشابہ کی ہے اس لیے کہ اس میں بظاہر باطل کو حق پر غلبہ حاصل ہوا جس سے کفار کو یہ گمان ہوا کہ جنگ میں کامیابی و ناکامی کا تعلق صرف تدابیر اور اسباب و وسائل ہی سے ہے اس میں نہ خدا کو کوئی دخل ہے اور نہ اس کا کوئی تعلق حق اور باطل سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک شدید قسم کی غلط فہمی تھی، جس کا دور ہونا نہایت ضروری تھا چنانچہ جب اس کے دور کرنے کے لیے مناسب وقت آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں یہ دور فرمائی اور یہ اس سلسلے کی ایک عظیم آیت ہے۔

زیغ کی حقیقت

اس آیت میں زیغ کا جو لفظ آیا ہے مختصراً اس کی حقیقت بھی سمجھ لینی چاہیئے۔

زیغ کے اصل معنی میل یعنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ بیک وقت دو مفہوموں کا حامل ہے، ایک کجی اور دوسرے سقوط، کوئی چیز جو کھڑی ہو جب جھک جاتی ہے تو گرنے سے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ حالت اس رسوخ کے برعکس حالت ہے جو اس آیت میں وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کی بیان ہوئی ہے۔

اہل کتاب کی عام بیماری

یہ زیغ یوں تو اہل ضلالت کی عام بیماری ہے لیکن اہل کتاب اس مرض میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ مبتلا رہے ہیں۔ یہود کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ شروع ہی سے اس بیماری میں مبتلا رہے۔ اور ان کے زیغ کا یہ پہلو خاص طور پر نہایت سنگین ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں اس میں مبتلا رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے سبب سے خدا کے غضب میں مبتلا ہوئے۔ قرآن میں اس بات کا ذکر ہوا ہے۔ سورہ صف میں اس کا ذکر اس طرح ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (صف - ۵)	اور یاد کرو جب موسٰی نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے کیوں دکھ پہنچا رہے ہو جب کہ تم اچھی طرح یہ جان چکے ہو کہ میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پس جب وہ کج ہو گئے تو خدا نے بھی ان کے دل کج کر دیے اور اللہ بدعہدوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

یہود و نصاریٰ کی گمراہی میں فرق

یہی یہود ہیں جنھوں نے کلمۃ اللہ اور اس قسم کے بعض دوسرے الفاظ کی حقیقت کی تشریح میں فلسفیانہ قسم کی موشگافیاں پیدا کرکے ان کو ایک گورکھ دھندا بنایا جس سے نصاریٰ کے لیے گمراہی کی راہیں کھلیں اور وہ حضرت مسیح کی الوہیت کے عقیدے میں مبتلا ہوئے۔ بعد میں نصاریٰ کی اس گمراہی پر مزید اضافہ بت پرست قوموں کی تقلید سے ہوا اور پھر آہستہ آہستہ وہ حق سے اتنے دور ہوگئے کہ اس سے ان کا رشتہ ہی منقطع ہو گیا اور وہ صریح کفر میں مبتلا ہوگئے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے بارے میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے یہ کہا کہ اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے) (مائدہ ۵: ۷۲)

یہود اور نصاریٰ کی گمراہی کی نوعیت میں بس یہ فرق ہے کہ یہود کی گمراہی اصلاً عملی ہے اور نصاریٰ کی اعتقادی۔ اس فرق کی وجہ سے حق کی مخالفت میں ان کا رویہ بھی ایک دوسرے سے مختلف رہا۔ یہود تو قرآن کو حق جاننے کے باوجود اس کی مخالفت کرتے تھے۔ نصاریٰ جس طرح تورات اور انجیل کے متشابہات میں پھنسنے کی وجہ سے گمراہ ہوئے تھے اسی طرح قرآن میں بھی ان کی ساری دلچسپی بس متشابہات ہی سے تھی۔ انہیں میں موشگافیاں کرکے وہ طرح طرح کے فتنے پیدا کرتے اور اس طرح اپنی گمراہی کا بھی سامان کرتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے۔ قرآن کے محکمات سے نہ انھوں نے خود دلچسپی لی اور نہ ان لوگوں کو دلچسپی لینے دی جن پر ان کا بس چلا۔ بالغرض قلب و نظر کے زیغ اور متشابہات کی پیروی کے باب میں تھے تو یہود و نصاریٰ دونوں ایک ہی سطح پر، یہ بیماری ان میں مشترک تھی لیکن ان کے ذوقی رجحانات ذرا الگ الگ تھے۔ یہود ابتغائے فتنہ سے زیادہ رغبت رکھتے تھے اور نصاریٰ ابتغائے تاویل سے۔ یہ گمراہیاں چونکہ دنیا کے تمام گمراہوں میں مشترک ہیں اس وجہ سے قرآن نے اسلوب بیان عام ہی رکھا ہے تاکہ کلام میں وسعت پیدا ہوسکے یہود و نصاریٰ کی تخصیص نہیں کی۔ لیکن قرآن کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اشارہ انھی کی طرف ہے۔ یہی انداز سورۂ فاتحہ میں بھی ہے۔ اس میں بھی مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور ضَآلِّيْنَ کے الفاظ ہرچند عام ہیں اور ان کے عام ہونے کی وجہ سے ان میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے لیکن ان کا خاص اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔

متشابہات سے گمراہی کی ایک مثال

متشابہات کی پیروی کی وجہ سے نصاریٰ جس قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے اس کو ایک مثال سے واضح کرنا مفید رہے گا۔

قرآن اور انجیل دونوں اس امر میں باہم متفق ہیں کہ حضرت مسیح کلمۃ اللہ ہیں۔ کلمۃ اللہ کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس سے امر و حکم کی تعبیر کی جاتی ہے۔ حضرت مسیح کی پیدائش چونکہ فطرت کے عام ضابطے کے خلاف ہوئی تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے کلمہ سے تعبیر کیا یعنی ان کی ولادت اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُن سے ہوئی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اصل شے کسی چیز کے واقع ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہی ہے۔ اسباب محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ یہ بات قرآن میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے اور اس میں کسی قسم

کا ایچ پیچ نہیں ہے جس سے کسی صاف ذہن کے آدمی کے اندر کوئی الجھن پیدا ہو سکے۔ قرآن نے نہایت غیر مبہم الفاظ میں فرمایا ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ آل عمران۔ ۵۹ (بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسی آدم کی، آدم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا بس وہ ہو گیا) یعنی آدم کو کلمۂ کن کے ذریعے سے حی و ناطق بنایا۔ اسی چیز کو دوسری جگہ نفخ روح سے تعبیر فرمایا ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے۔

نصاریٰ نے اس واضح بات میں جو تحریف کی اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب ان کو بت پرست قوموں سے سابقہ پیش آیا اور ان کے ساتھ ان کی مذہبی بحثیں شروع ہوئیں تو انھوں نے ان پر یہ اعتراض شروع کیا کہ تم تو ایک مصلوب خدا کی پرستش کرتے ہو، ہم تم سے ہزار درجے افضل ہیں اس لیے کہ ہم آسمانی دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ نصاریٰ نے اپنے حریفوں کے اس اعتراض سے بچنے کے لیے یہ کوشش کی کہ اپنے عقیدے کو بھی انھی کے عقیدے کے سانچے میں ڈھال دیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ مسیح تو ابن اللہ ہیں، وہ مخلوق نہیں ہیں۔ اپنے اس نئے عقیدے کی آرائش میں انھوں نے ایک طرف تو یونانیوں، مجوسیوں اور ہندوؤں کے فکر و فلسفہ سے مواد لیا اور دوسرے ان یہودی متکلمین کے علم کلام سے رہنمائی حاصل کی جو یہود کے آخری دور کی پیداوار تھے اور جو نہ صرف خالق اور مخلوق کے درمیان وسائل و وسائط کے قائل تھے بلکہ ان کو مستقل ذوات کا درجہ دیتے اور ان کو کلمۃ اللہ کہتے تھے۔ نصاریٰ نے بعینہٖ یہی عقیدہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے اختیار کر لیا۔ کچھ عرصے تک تو بات اسی حد تک رہی لیکن آہستہ آہستہ گمراہی سے گمراہی پیدا ہونی شروع ہوئی اور انھوں نے ان کو خدا کا کفو، اسی کے جوہر سے اور ازل سے اس کے ساتھ قرار دے دیا۔ اور پھر اس عقیدے کی تائید کے لیے انجیل یوحنا کے آغاز میں تحریف کے چور دروازے سے بعض عبارتیں بھی داخل کر دیں تاکہ باہر سے برآمد کیے ہوئے اس عقیدے کے لیے گھر کی ایک دلیل بھی فراہم ہو جائے۔

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗ پر توقف ہے

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ (اور اس کی اصل حقیقت نہیں جانتا مگر اللہ) اوپر کی تفصیلات سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ یہاں وقف ہے۔ یہی مذہب جمہور اہل سنت کا ہے اور یہی حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، مالک بن انسؓ، کسائی اور فرا سے منقول ہے۔ البتہ شیعہ اور بعض متکلمین یہاں وصل کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک متشابہات کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں۔ اس کی وجہ جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے، وہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اماموں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کو ہر بات کا علم ہوتا ہے۔ رہے دوسرے لوگ جو اس بات کے قائل ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ تاویل سے مراد معنی لیتے ہیں حالانکہ آیت کا سیاق و سباق اس

کے خلاف ہے۔ اوپر اس کی وضاحت ہو چکی ہے[1]

اگرچہ آیت کے الفاظ اور اس کے مختلف اجزا کی اس وضاحت کے بعد آیت کی صحیح تاویل خود بخود سامنے آگئی ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر مزید اطمینان کے لیے ہم اس کا واضح مفہوم بھی پیش کیے دیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ وہی خدا جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی، جو زندہ بھی ہے اور قیوم بھی، اسی نے تورات اور انجیل اتاریں۔ پھر جب ان میں گھپلا کر دیا گیا تو اس کی حکمت اور قیومیت مقتضی ہوئی کہ یہ قرآن اتارے تاکہ اس کے ذریعے سے حق و باطل میں امتیاز ہو سکے تو جو لوگ اس کی مزاحمت کریں گے وہ یاد رکھیں کہ خدائے عزیز حق کو مظلوم نہیں چھوڑے گا، وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔

اس کے بعد اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اہل کتاب جو اس فرقان کی مخالفت کر رہے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہ اس کتاب میں کوئی بات ایسی ہے جو ان کی وحشت کا باعث ہو رہی ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ان کے اپنے دلوں میں کجی ہے۔ اس کجی کے سبب سے ان کو اس کتاب کے محکمات سے، جن کی حیثیت اصل کتاب کی ہے اور جن پر اس کی تمام تعلیمات اور اس کے سارے حکمت و فلسفہ کی بنیاد ہے، کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ انہیں اگر دلچسپی ہے تو بس اس کی ان آیات متشابہات سے ہے جن میں کوئی بات تمثیلی و تشبیہی رنگ میں بتائی گئی ہے۔ وہ اپنی طبیعت کے بگاڑ کے سبب سے انھی کے درپے ہوتے ہیں اور فساد انگیزی اور فتنہ آرائی کے لیے ان کی صورت و حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ جس حد تک ان کا علم ضروری ہے وہ خدا نے کھول دیا ہے، بس اتنے پر قناعت کرنی چاہیے، ان کی اصل حقیقت کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرنا چاہیے، وہ اس دن کھلیں گی جس دن وہ سامنے آئیں گی۔ جو لوگ علم میں راسخ ہیں ان کی روش متشابہات کے معاملے میں یہی ہے وہ محکمات اور متشابہات دونوں کو اپنے رب ہی کا عطیہ سمجھتے ہیں اور دونوں پر یکساں ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے علم کی پختگی کی وجہ سے اس رمز سے واقف ہیں کہ آیات الٰہی کا مقصود بندوں کو یاد دہانی ہے اور چونکہ وہ عقل رکھتے ہیں اس وجہ سے ان سے جو فائدہ اٹھانا چاہیے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، کسی سعی نامراد و لاطائل میں اپنا وقت برباد کر کے اپنے خسران کے اسباب نہیں فراہم کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ اس کی آیات سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو عقل رکھتے ہیں اور اس عقل سے صحیح طور پر کام لیتے ہیں۔

---

[1] ان مطالب کا اکثر حصہ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے، صرف بعض مطالب کی توضیح میری طرف سے ہے۔ اس وجہ سے اس کی صحیح باتیں مولانا کی طرف منسوب کیجیے اور اگر کہیں خامی ہو تو اس کی ذمہ داری تنہا میرے سر ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۸-۹

ان دونوں آیتوں میں کوئی لغوی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ زیغ کے لفظ کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔

یہ راسخین فی العلم کی دعا ہے جس سے اس امر کا اظہار ہو رہا ہے کہ وہ اپنے دین کے معاملے میں اتنے بے پروا نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ شبہات اور شکوک کو بلاوے بھیج کر بلائیں اور اپنے ایمان و اسلام کو خطرے میں ڈالیں بلکہ وہ اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے برابر اپنے پروردگار سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ دین میں ان کے جمے ہوئے قدم اکھڑنے نہ پائیں اور جب فتنوں کی یورش ہو تو خدائے وہاب اپنے پاس سے ان کے لیے وہ روحانی کمک بھیجے جو ان کے ثباتِ قدم کا ذریعہ بنے۔

دوسری آیت میں اس یقین کا اظہار ہے جو ان راسخین کے اندر آخرت کے باب میں ہوتا ہے۔ موقع کلام یہاں اشارہ کر رہا ہے کہ درحقیقت یہی یقین ہے جو دل اور عقل دونوں کا اصلی پاسبان ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کے ذہن و فکر کو کوئی چیز بھی ہرزہ گردی سے نہیں روک سکتی۔ وہ زندگی کو ایک نہایت سہل بازی سمجھتا ہے اور ہر داؤں پر اس کو لگا دینے کے لیے تیار رہتا ہے لیکن جن کے اندر آخرت کا یقین رچا بسا ہوتا ہے وہ ہر قدم احتیاط کے ساتھ اٹھاتے اور نہایت پھونک پھونک کر رکھتے ہیں، یہ احتیاط ان کو ہمیشہ جادۂ مستقیم پر استوار رکھتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔ ۱۰-۱۱

راہِ حق کی اصلی رکاوٹ

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے یہاں مراد، جیسا کہ آیت ۴ میں گزر چکا ہے، قرآن کے منکرین ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ مال و اولاد، جن کی محبت آج ان کے لیے ایک سورج سے زیادہ واضح حق کے قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے، انھیں خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکیں گے۔ اس وجہ سے ان کی محبت میں اس خدا کو نہیں بھولنا چاہیے جس کے حقوق سب پر مقدم ہیں اور جس کی پکڑ بھی بے پناہ ہے۔ مال و اولاد کا ذکر یہاں قبولِ حق کی راہ کے اصل حجاب کی حیثیت سے ہوا ہے۔ آگے آیت ۱۴ میں ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ آ رہا ہے۔ درحقیقت انھی کی محبت ہے جو انسان کے لیے قبولِ حق میں رکاوٹ بنتی ہے لیکن انسان اصل حقیقت کے اعتراف سے گریز کرتا ہے اور اپنے اغراض کے لیے کچھ ایسے بہانے تلاش کرتا ہے جو اس کی اصل بیماری پر پردہ ڈال سکیں۔ قرآن نے یہ ان لوگوں کی اصلی اندرونی بیماری سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ درحقیقت مال و اولاد کی محبت ہے جو انھیں قرآن کی پیش کردہ سچائیوں کے آگے جھکنے سے روک رہی ہے لیکن وہ اس کو چھپانے کے لیے متشابہات کے اندر سے کچھ اعتراضات و شبہات پیدا کرنے کی

کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی دنیا پرستی بے نقاب نہ ہونے پائے۔ انسان کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ ایک حقیقت سے گریز تو اختیار کرتا ہے اپنے نفس کی کسی کمزوری کے سبب سے لیکن نمائش کچھ ایسی کرتا ہے جس سے مخاطب پر یہ اثر پڑے کہ فی الواقع اس کے اس گریز کے لیے کچھ وجوہ و اسباب اور کچھ اعتراضات و شبہات ہیں۔

اصل بیماری پر پردہ ڈالنے کی کوشش

اس کے بعد فرمایا کہ ان کی یہ روش بعینہٖ وہی روش ہے جو اس سے پہلے فرعون اور اس کی قوم نے اور خدا کے رسولوں کو جھٹلانے والی دوسری قوموں نے اختیار کی۔ انھوں نے بھی جان بوجھ کر محض دنیا کی محبت میں، خدا کی نشانیوں اور اس کی آیتوں کو جھٹلایا اور ظاہر یہ کرنے کی کوشش کی کہ گویا وہ نبی کو کوئی کاہن یا جادوگر اور اس کی پیش کردہ نشانیوں کو کوئی سحر و شعبدہ خیال کر رہے ہیں اس وجہ سے ان کو قبول نہیں کر رہے ہیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا اور جب پکڑ لیا تو پھر کوئی نہیں تھا جو خدا کی پکڑ سے ان کو بچا سکے۔

'شدید العقاب' کا مفہوم

'شَدِیْدُ الْعِقَابِ' کے لفظ میں دو مفہوم موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا کی طرف سے انسان کو جو سزا بھی ملتی ہے وہ انسان کے اپنے ہی اعمال کا ردِ عمل ہوتی ہے، دوسرا یہ کہ جس طرح خدا کے قوانین طبیعی کے نتائج بے لاگ اور لازمی ہیں اسی طرح خدا کے اخلاقی قوانین کے نتائج بھی بے لاگ اور لازمی ہیں جب ان کے ظہور کا مرحلہ آئے گا تو وہ اس طرح بے لاگ لپیٹ اور ایسی قطعیت اور قوت کے ساتھ ظاہر ہوں گے کہ نہ کوئی ان سے بچ سکے گا اور نہ کوئی ان سے بچا سکے گا۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (۱۲)

منکرین قرآن کو عذاب کی دھمکی

اب یہ صاف صاف قرآن کے تمام منکرین کو دھمکی ہے کہ تم قرآن کے خلاف یہ سازشیں جو کر رہے ہو، کامیاب ہونے والی نہیں ہیں، تم قرآن کے حاملین کے ہاتھوں شکست اٹھاؤ گے اور تمہارے یہ اسباب و وسائل جن پر تمہیں بڑا ناز ہے اور تعداد کی یہ کثرت جس پر تمہیں بڑا بھروسا ہے، یہ چیزیں ذرا بھی کام آنے والی ثابت نہیں ہوں گی۔ تم دنیا میں بھی مغلوب ہو گے اور آخرت میں بھی جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور اس جہنم کو کوئی سہل چیز نہ خیال کرو، یہ نہایت بُرا ٹھکانا ہے۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ جو چیز انسان نے دیکھی نہ ہو اول تو اس کا صحیح صحیح اندازہ ہی نہیں کر پاتا اور اگر کسی حد تک اندازہ کرتا بھی ہے تو اپنی غفلت و سرشتی کے سبب سے اس کو ملحوظ رکھنے میں سہل انگار اور بے پروا ہو جاتا ہے۔

قَدْ کَانَ لَکُمْ اٰیَةٌ فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰی کَافِرَةٌ یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ (۱۳)

غزوۂ بدر سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت

یہ اوپر والے دعوے کی ایک دلیل ایک ایسے واقعے سے پیش کی گئی ہے جس پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔ اشارہ بدر کے واقعے کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کے حاملین اور اس کے مخالفین

میں اس وقت جو کشمکش برپا ہے اس میں بالآخر شکست مخالفین ہی کو ہوگی۔ اس پیشین گوئی کی صداقت کی ایک نشانی اس معرکے میں موجود ہے جو قریش اور مسلمانوں کے درمیان پیش آچکا ہے۔ اس معرکے میں ایک گروہ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے اٹھا تھا اور دوسرا، جو کفار کا تھا، شیطان کا کلمہ بلند کرنے کے لیے۔ ہر چند کفار کی تعداد ہزار سے متجاوز تھی اور مسلمان کل تین سو تیرہ تھے لیکن جب مقابلے کی نوبت آئی تو کفار نے کھلی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھا یہ بات اللہ تعالیٰ کی خاص تائید و نصرت کی وجہ سے ہوئی اور فتح و شکست کا اصلی تعلق تعداد کی کثرت و قلت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ہی سے ہے اور یہ تائید و نصرت ان کو حاصل ہوتی ہے جو اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اٹھتے ہیں۔ جو لوگ آنکھیں رکھتے ہیں وہ اس واقعے میں مستقبل کا نقشہ دیکھ سکتے ہیں کہ حق و باطل کی یہ آویزش بالآخر کس فیصلے پر ختم ہونے والی ہے۔

غزوۂ بدر میں کفار کے لیے نشانی

بدر کے واقعہ میں کفار کے ان تمام گروہوں کے لیے غلبۂ حق کی نشانی موجود تھی جو اس وقت قرآن اور اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اس وقت یہود، نصاریٰ اور قریش تین جماعتیں براہِ راست اسلام کی مخالفت کر رہی تھیں، اب دیکھیے کہ ان تینوں جماعتوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کس طرح بدر کے معرکے کو ایک نشانی بنایا۔

یہود کے لیے نشانی

جہاں تک یہود کا تعلق ہے سورۂ بقرہ میں ہم، طالوت و جالوت کی جنگ کے سلسلہ میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ جنگ اپنے مقصد، اپنی خصوصیات، اپنے نقشہ اور طالوت کی فوج کی تعداد کے لحاظ سے بالکل جنگ بدر کا آئینہ تھی۔ جس طرح مسلمان اپنے گھروں سے نکالے اور اپنے قبلہ سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح بنی اسرائیل بھی اپنے گھروں سے بے دخل اور اپنے قبلہ — تابوت — سے محروم کیے گئے تھے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تین سو تیرہ آدمی تھے اسی طرح طالوت کے ساتھ بھی، جیسا کہ بنی اسرائیل کی روایات سے معلوم ہوتا ہے، اتنے ہی آدمی تھے، جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معرکہ سے پہلے اپنی فوج کے حوصلے کا امتحان لیا، اسی طرح ایک خاص طریقے پر طالوت نے بھی اپنے ساتھیوں کے عزم و نظم کی جانچ کی، پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جنگ میں اپنی تائید و نصرت سے نوازا کہ نہایت ناموافق اور ناسازگار حالات میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور قریش کے بڑے بڑے لیڈر مارے گئے اسی طرح طالوت کی اور ان کے ساتھیوں کی بھی اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور ان کے ساتھیوں کی قلیل تعداد دشمنوں کی نہایت بھاری تعداد پر غالب رہی اور فلسطینیوں کا مشہور سپہ سالار حضرت داؤدؑ کی فلاخن سے ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ ان دونوں جنگوں کی یہ حیرت انگیز مشابہت یہود پر بالکل واضح تھی، ایک کا سارا نقشہ اپنے صحیفوں میں دیکھ چکے تھے اور دوسری کا سارا ماجرا انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے لیے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں تھا کہ بدر کے میدان میں ہتھیاروں کی لڑائی نہیں تھی بلکہ حق و باطل کی

جنگ تھی اور انسانوں اور انسانوں کی آویزش نہیں بلکہ فرشتوں اور شیطانوں کی جنگ تھی۔ چنانچہ قرآن میں، جیساکہ سورۂ انفال کی تفسیر میں ہم وضاحت کریں گے، اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ یہود پر یہ حقیقت پوری طرح آشکارا تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نشانی کی کوئی قدر نہیں کی اور برابر اسلام کی مخالفت ہی کرتے رہے۔

نصاریٰ کے لیے نشانی

اسی طرح نصاریٰ کے لیے بھی اس جنگ میں بہت بڑی نشانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی موجود تھی۔ یوحنا کے مکاشفات میں یہ مکاشفہ موجود ہے کہ نبی موعود (خاتم النبیین، صلی اللہ علیہ وسلم) جب ظاہر ہوں گے تو وہ حق کی طاقت کے ساتھ جہاد کریں گے اور ان کے جلو میں کروبیوں کا لشکر ہوگا۔ یہ پیشینگوئی بدر کے موقع پر اس طرح ظاہر ہوئی کہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے ملائکہ کو کفار سے لڑتے دیکھا۔ اس نشانی کے بعد بھی اگر نصاریٰ متشابہات کے چکروں ہی میں پھنسے رہے اور اعترافِ حق کی سعادت انھیں حاصل نہیں ہوئی تو اس کو ان کی بدبختی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

قریش کے لیے نشانی

قریش کے لیے تو یہ جنگ ان کے اپنے مطالبے کے لحاظ سے بھی قرآن اور اسلام کی حقانیت کی ایک ناقابلِ تردید شہادت تھی۔ انھوں نے خود نہایت آشکارا طور پر اس جنگ کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی ایک کسوٹی قرار دیا تھا۔ اُن کا اپنا اعلان یہ تھا کہ اس جنگ میں جس کی جیت ہوگی وہ حق پر سمجھا جائے گا اور جس کو شکست ہوگی وہ باطل پر۔ ابوجہل نے عینِ میدانِ جنگ میں یہ دعا کی تھی کہ اَللّٰھُمَّ اَقْطَعُنَا للرحم فاحنہ الغداۃ (اے اللہ فریقین میں سے جو سب سے زیادہ رشتہ رحم کا کاٹنے والا ہے کل تو اس کو کچل دیجیو!) اس جنگ کے متعلق قرآن نے بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہایت غیر مبہم الفاظ میں پیشین گوئیاں فرمائی تھیں جو حرف بحرف پوری ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو قریش کے خاص خاص لیڈروں کے قتل ہونے کی جگہیں تک متعین کر دی تھیں اور جنگ کے خاتمہ پر لوگوں نے دیکھا کہ حضورؐ کی ہر بات سچی ثابت ہوئی۔ چنانچہ انھی وجوہ سے قرآن نے غزوۂ بدر کو فرقان سے تعبیر فرمایا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے حق و باطل کے درمیان ایک ایسا امتیاز قائم کر دیا جس سے اسلام کے موافقین کو اپنے برحق ہونے کی دلیل مل گئی اور اس کے مخالفین پر اللہ کی حجت پوری ہوگئی۔

حذف کا ایک اسلوب

آیت میں اہلِ ایمان کے گروہ کی صفت یہ بیان کی ہے کہ یہ اللہ کی راہ میں جنگ کر رہا تھا، لیکن کفار کے متعلق اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ ان کی جنگ کس کی راہ میں تھی۔ اس تصریح کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کا یہ معروف اسلوب قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے کہ دو متقابل باتوں میں سے بخیالِ اختصار ایک متقابل کو حذف کر دیتے ہیں اس لیے کہ مذکور خود محذوف کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے۔ یہاں اس اسلوب کے بموجب پوری بات اگر کھول دی جائے تو یوں ہوگی، فِئَۃٌ مُّؤْمِنَۃٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاُخْرٰی کَافِرَۃٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ، فقرے کے پہلے حصے میں سے لفظ 'مُوْمِنَۃ' کو حذف کر دیا اور

دوسرے میں سے فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ کو اس لیے کہ دوسرے میں کَافِرَۃٌ کی صفت پہلے میں مُؤْمِنَۃٌ کا پتہ دے رہی ہے اور پہلے میں فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کا حوالہ دوسرے میں فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ کی ضرورت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حذف کا یہ اسلوب قرآن مجید میں بہت استعمال ہوا ہے جو واضح نہ ہو تو کلام کا اصلی زور سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ایجاز کی ایک شاخ ہے اور ایجاز بلاغت کی جان ہے۔

کس نے کس کو دگنا دیکھا

یَرَوْنَھُمْ مِّثْلَیْھِمْ میں یَرَوْنَھُمْ کی قرأت نافع نے تَرَوْنَھُمْ کی ہے لیکن یہ قرأت ہمارے نزدیک بطور تفسیر ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ فعل مخاطبین یعنی کفار کے لیے ہے یعنی اے کافرو! تمہارا حال یہ تھا کہ تم مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی اس تفسیر سے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ حریف کو اپنے سے دگنا دیکھنے کا معاملہ مسلمانوں کو نہیں پیش آیا بلکہ کفار کو پیش آیا۔ نافع کی یہ تاویل بہت صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ آیت میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ اس چیز کو اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے ایک آیت (نشانی) بنایا اور اس بات کی بھی خاص طور پر تصریح فرمائی کہ انھوں نے اس نشانی کو سر کی آنکھوں سے دیکھا۔ اگر واقعہ اس کے برعکس ہوتا، مسلمانوں نے کفار کو اپنے سے دگنا دیکھا ہوتا تو اس میں کفار کے لیے کیا نشانی تھی اور ان کو مخاطب کر کے اس نشانی کا ذکر کیوں کیا جاتا؟

ایک سوال کا جواب

ایک سوال ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں یہاں پیدا ہو۔ وہ یہ کہ سورہ انفال میں جہاں غزوۂ بدر کا واقعہ بیان ہوا ہے وہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار بھی مسلمانوں کی نظر میں کم کر کے دکھائے گئے تھے اور مسلمان بھی کفار کی نگاہوں میں کم دکھائے گئے تھے۔ یہ چیز آیت کی مذکورہ بالا تاویل کے خلاف پڑتی ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ کم دکھانے اور زیادہ دکھانے کا معاملہ دو مختلف مرحلوں میں دو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔ میدان جنگ میں اترنے سے پہلے تو بلاشبہ یہی صورت رہی کہ مسلمانوں نے بھی کفار کی تعداد معمولی محسوس کی اور کفار نے بھی مسلمانوں کو نہایت حقیر پوزیشن میں محسوس کیا لیکن میدان جنگ میں عملاً اتر جانے اور جنگ کے بالفعل شروع ہو جانے کے بعد دفعتہً صورت حال بدل گئی۔ اب جو کفار نے میدان جنگ پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ نقشہ ہی اور ہے، فرشتوں کی شرکت سے مسلمانوں کی فوج کو اتنی فوقیت حاصل ہو گئی کہ وہ کفار کی نگاہوں میں ان سے دگنی نظر آنے لگی۔ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف مرحلوں میں ظاہر ہونا ایک خدا ساز بات تھی اور مقصود اس سے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل کو ایک دوسرے سے ٹکرائے اور حق کی امداد کے لیے اپنی غیبی تائید و نصرت ظاہر فرما کر حق کے مخالفوں پر اپنی حجت تمام کرے۔ چنانچہ اس حکمت کے تحت اس نے ابتدائی مرحلے میں مسلمانوں کی نگاہوں میں کفار کو اور کفار کی نگاہوں میں مسلمانوں کو کم کر دکھایا تاکہ ان میں کوئی فریق بھی ایک دوسرے سے ٹکر لینے سے خوف نہ کھائے۔ لیکن جب دونوں میں ٹکر ہو گئی اور میدان جنگ گرم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ذریعے سے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور کفار میدان جنگ کا نقشہ دیکھ کر بالکل مرعوب ہو گئے۔

ہم یہاں سورۂ انفال کی متعلق آیتیں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ دونوں موقعوں کا فرق اور دونوں کی حکمت و مصلحت سامنے آجائے، ارشاد ہوا ہے۔

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَ
هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ
أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَاخْتَلَفْتُمْ
فِي الْمِيعَادِ وَلَٰكِنْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا
كَانَ مَفْعُولًا لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ
عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ
بَيِّنَةٍ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ
إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ
قَلِيلًا وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا
لَفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي
الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ
إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ
وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ
فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ
فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا
كَانَ مَفْعُولًا وَإِلَى اللَّهِ
تُرْجَعُ الْأُمُورُ
(۴۲ - ۴۴ - انفال)

اور یاد کرو جب تم وادی کے ورلے کنارے پر تھے
اور وہ پرلے سرے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے تھا
اور اگر تم ایک دوسرے کو الٹی میٹم دے کر نکلتے تو میعاد
میں ضرور اختلاف کرتے لیکن اللہ نے اس کا سامان کیا
تاکہ ایسے معاملے کا فیصلہ فرمائے جس کا فیصلہ ہو نا طے
ہو چکا تھا۔ تاکہ جس کو ہلاکت کی راہ اختیار کرنی ہے وہ
یہ راہ اتمام حجت کے بعد اختیار کرے اور جسے زندگی کی
راہ اختیار کرنی ہے وہ بھی دلیل کے ساتھ یہ راہ اپنائے
بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ خیال کرو
جب کہ اللہ تمھیں ان کو دکھا تا ہے رویا میں قلیل التعداد
اور اگر وہ ان کو کثیر التعداد دکھاتا تو تم ہمت ہار بیٹھتے
اور اس امر میں اختلاف کرتے۔ لیکن اللہ نے تمھیں اس
سے بچایا۔ وہ سینوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے اور
خیال کرو جب کہ وہ تمھیں ان کو دکھاتا ہے، اس وقت
جب کہ تم آمنے سامنے ہوئے، تمھاری نگاہوں میں تھوڑا
اور تم کو دکھاتا ہے ان کی نگاہوں میں تھوڑا تاکہ ایک
ایسے معاملے کا فیصلہ کر دے جس کا فیصلہ کرنا طے ہو
چکا ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی کہ آیت زیر بحث اور آیات انفال میں موقع و محل کا فرق ہے۔
انفال میں جس موقع کا ذکر ہے وہ، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، جنگ شروع ہونے سے پہلے کا ہے۔ اور آیت زیر بحث میں جنگ شروع ہو جانے کے بعد کا جب تائید الٰہی ملائکہ کی کمک کی صورت میں ظاہر ہو گئی ہے۔ اس طرح ان دونوں آیتوں میں پوری پوری موافقت ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ انفال میں بھی یہ اشارہ موجود ہے کہ جنگ شروع ہو جانے کے بعد کفار کو میدان جنگ کا نقشہ کچھ اور ہی نظر آیا اور اس مشاہدہ نے ان کے حوصلے پست کر دیے۔ ان اشارات کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ وہیں ہم یہ بھی واضح کریں گے کہ یہود اگرچہ در پردہ قریش کو مسلمانوں پر چڑھا لانے کی سازش میں شریک رہے لیکن بدر کا نقشہ دیکھ کر انھوں نے بھی ہمت

چھوڑ دی۔ وَاللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تائید و نصرت سے جس کو چاہے نواز سکتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور جس کو وہ اپنی تائید و نصرت سے نوازے اس کے لیے کثرت و قلت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو قطرے کو دریا اور ذرے کو آفتاب بنا دے۔ کتنے کمزور و ناتواں گروہوں کو اس نے دل بادل فوجوں پر فتح عطا فرمائی ہے۔ فتح و شکست کا اصلی سررشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

عبرت کا مفہوم

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ، عبرت کے معنی ہیں ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کر جانا۔ ایک صاحبِ بصیرت اور ایک بلید میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ ایک اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھتا لیکن دوسرے کے لیے ایک معمولی سی نشانی، ایک ادنیٰ سی تنبیہ اور ایک سرسری سا اشارہ حقائق کا ایک دفتر کھول دیتا ہے۔ ایک دروازہ اس کے لیے کھل جائے تو دوسرے دروازے کھولنے کے لیے کلید ہاتھ آجاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن "اولوا الابصار" کہتا ہے کیونکہ ان کی آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت کا نور بھی ہوتا ہے جو جزو میں کل اور قطرہ میں دجلہ کے مشاہدہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالۡبَنِیۡنَ وَالۡقَنَاطِیۡرِ الۡمُقَنۡطَرَۃِ مِنَ الذَّهَبِ وَالۡفِضَّۃِ وَالۡخَیۡلِ الۡمُسَوَّمَۃِ وَالۡاَنۡعَامِ وَالۡحَرۡثِ ؕ ذٰلِکَ مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَاللّٰہُ عِنۡدَہٗ حُسۡنُ الۡمَاٰبِ (۱۴)

تزئین کی حقیقت

شہوات کا لفظ یہاں مشتہیات یعنی مرغوبات کے معنی میں ہے۔ مال و اولاد اور زن و فرزندان چیزوں میں سے ہیں جو انسان کو بالطبع مرغوب بھی ہیں اور ان کو مرغوب ہونا چاہیے بھی اس لیے کہ یہ چیزیں اس کے ذاتی و نوعی بقا کے لوازم میں سے ہیں لیکن یہاں مجرد ان کی رغبت زیرِ بحث نہیں ہے بلکہ ان کی تزئین کا ذکر ہے۔ 'تزئین' کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز اس طرح آنکھوں میں کھب جائے کہ آدمی اس کے اثر سے ہر چیز اسی کے رنگ میں دیکھنے لگ جائے۔ یہاں تک کہ اس سے الگ ہو کر اس کے لیے کسی چیز کو دیکھنا ممکن ہی نہ رہ جائے۔ وہ ہر چیز کو تولنے اور پرکھنے کے لیے اسی کو پیمانہ اور کسوٹی قرار دے لے۔ کسی چیز کی رغبت کا اس درجہ غلبہ ظاہر ہے فاطرِ فطرت کے منشا کے خلاف ہے۔ اسی سے زندگی میں وہ بے اعتدالیاں ظہور میں آتی ہیں جو انسان کو فطرت اور شریعت کے جادۂ مستقیم سے ہٹا دیتی ہیں۔ یہ ایک بیماری کی حالت ہے جو بے بصیرتی اور حدودِ الٰہی کے عدمِ احترام یا بالفاظِ دیگر عدمِ تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں اصل دخل نفس اور شیطان کا ہوتا ہے۔ نفس اپنی چاہتوں میں فطری حدود سے آگے نکل جاتا ہے، پھر شیطان ان چاہتوں پر ایسا دلفریب ملمع کر دیتا ہے کہ آدمی کی نظر ان سے ہٹ کر کسی اور طرف کا رخ ہی نہیں کرتی۔ قرآن نے اسی وجہ سے اس تزئین کو دوسرے مقامات میں شیطانوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

قنطار اور مقنطرۃ کا مفہوم

'قِنۡطَار' کے معنی مالِ کثیر کے ہیں۔ اس کے ساتھ 'مُقَنۡطَرَۃ' کی صفت اسی طرح استعمال ہوتی ہے جس

طرح عربی میں 'لیل الیل' یا 'ظل ظلیل' وغیرہ کی ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں۔

'مسومۃ' کا مفہوم

'مسومۃ' سومۃ سے ہے جس کے معنی علامت کے ہیں۔ 'مسومۃ' کے معنی ہوں گے، نشان زدہ چونکہ اصیل اور نفیس گھوڑوں پر بالعموم نشان لگایا جاتا ہے اس وجہ سے یہ لفظ اصالت اور عمدگی کی تعبیر کے لیے معروف ہو گیا۔

'الناس' سے ایک خاص گروہ مراد ہے۔

آیت میں 'الناس' کا لفظ اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن مراد اس سے ایک خاص گروہ ہے۔ یہ اسی طرح کا استعمال ہے جس طرح قرآن میں 'انسان' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور مقصود اس سے مخصوص وہ گروہ ہوتا ہے جس کے حالات اس مقام میں زیر بحث ہوتے ہیں۔ یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ وہ لوگ مراد ہیں جو بصیرت اور تقویٰ سے عاری ہیں اس وجہ سے دنیا کی مرغوبات پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں اور قرآن جن اعلیٰ اقدار کی طرف توجہ دلا رہا ہے ان کی طرف وہ آنکھ ہی نہیں اٹھاتے۔

مرغوباتِ نفس

مرغوبات نفس کے بیان میں ایک خاص ترتیب ملحوظ ہے جو نگاہ میں رکھنے کی ہے۔ پہلے اہل و عیال کا ذکر کیا ہے اس لیے کہ محبت کے لحاظ سے سب سے اونچا مقام انھی کا ہے، دوسری چیزوں کی محبت اصلاً ان کے تابع ہے بلکہ زیادہ تر انھی کے لیے ہے۔ اس کے بعد مال کا ذکر ہے اور مال میں سونے کا ذکر اس کی گراں قیمتی کی وجہ سے دوسرے نقود پر مقدم ہے۔ پھر سامان میں سب سے پہلے گھوڑوں کا ذکر ہے اس لیے کہ اہلِ عرب زینت، فخر اور دفاع، تینوں کے نقطۂ نظر سے گھوڑے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کے بعد چوپایوں کا ذکر ہے اس لیے کہ تمدن کے ظہور سے پہلے بدویت کے دور میں معاش کا انحصار بیشتر انھی پر تھا۔ آخر میں کھیتی اور باغ کا ذکر ہے اس لیے کسان کی اہمیت تمدن کے دور میں داخل ہونے کے بعد شروع ہوئی ہے جب انسان نے شہروں اور دیہاتوں کی رہائش اختیار کی ہے۔

'ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا' کے چھوٹے سے فقرے میں معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ اس میں اس دنیا کی ناپائداری کی طرف بھی اشارہ ہے، ان چیزوں کی بے حقیقی کی طرف بھی، اور ایک عالم باقی کے مقابل میں اس جہانِ فانی کی ناپائدار لذتوں پر ریجھنے کی حماقت کی طرف بھی۔

نظم کے پہلو سے یہ آیت گویا اوپر کی آیت ۹ کے مضمون کی تشریح ہے۔ اس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اصل چیز جو لوگوں کو قرآن کی مخالفت پر اکسا رہی ہے وہ ہے تو اس دنیا کی محبت اور اس کی مرغوبات کی طمع لیکن اس بیماری کو چھپائے رکھنے کے لیے یہ طرح طرح کے شبہات و شکوک اور اعتراضات ایجاد کرتے اور پھیلاتے ہیں تاکہ اس طرح اپنے اس گریز کے لیے جواز پیدا کریں۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۗ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۚ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ

(١٥-١٧)

مخاطبین کو زاویۂ نگاہ بدلنے کی دعوت

یہ مخاطبین کو زاویۂ نگاہ بدلنے کی دعوت ہے اس لیے کہ اس کے بدلے بغیر قرآنی اقدار کی طلب دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے نزدیک انسان کی اصل بیماری اس کی تنگ نظری اور پست حوصلگی ہے۔ وہ اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو کل زندگی سمجھ بیٹھا ہے۔ جس کے سبب سے اس کی ساری بھاگ دوڑ اسی دنیا کی مرغوبات و مطلوبات تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے حالانکہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے جو ابدی اور لازوال ہے۔ اگر انسان اس زندگی کی طلب میں تقویٰ کی روش اختیار کرے یعنی اس دنیا سے متعلق خدا نے جو حدود حرام و حلال ٹھہرا دیے ہیں ان کی پابندی کرے تو اسے آخرت کی ابدی زندگی میں وہ نعمتیں ملیں گی جن کا آج وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ازواج مطہرہ

نعمتوں میں 'ازواج مطہرۃ' کا ذکر خاص طور پر فرمایا ہے۔ اس لفظ پر بقرہ کی آیت ۲۵ کے تحت ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہاں خاص طور پر جنت کی نعمتوں میں اس کا ذکر اس وجہ سے ہوا کہ اوپر آیت ۱۴ میں واضح ہو چکا ہے کہ دنیا کے مرغوبات میں سر فہرست جس چیز کو جگہ حاصل ہے وہ اہل و عیال ہیں اس وجہ سے جنت کی نعمتوں میں بھی ان کا ذکر خاص طور پر فرمایا۔

رضوان

'رضوان' کے معنی تو خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے ہیں، لیکن قرآن میں یہ لفظ بالعموم جنت کی نعمتوں کی ایک جامع تعبیر کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جب اس کا ذکر ہو گیا تو گویا ہر نعمت کا ذکر ہو گیا۔ اس کا بھی جس کے لیے تعبیر کا کوئی جامہ موجود ہے اور اس کا بھی جو گمان و خیال اور قیاس و وہم ہر چیز سے بالاتر ہے۔

'بصیر بالعباد' میں دھمکی اور تسلی دونوں ہے

'وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ' دھمکی اور تسلی دونوں ہی قسم کے مواقع پر استعمال ہو سکتا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ تسلی کے محل میں ہے۔ یعنی جو لوگ آخرت کے لیے اس دنیا کی زندگی میں تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی تمام قربانیوں اور مشقتوں سے باخبر ہے۔ ان کو ان تمام قربانیوں کا پورا پورا صلہ دے گا، ان کی کوئی قربانی بھی ضائع نہیں جائے گی۔

'اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ الآیۃ' 'لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا' سے بدل ہے۔ یہ تفصیل ان لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو قرآن کی اس دعوت کو قبول کر کے آخرت سے غافل کرنے والی مرغوبات سے دستکش ہو گئے اور اپنی پچھلی زندگی کی خود فراموشیوں سے تائب ہو کر ایمان و عمل صالح کی پاکیزہ زندگی میں آ گئے، ساتھ ہی اس میں ایک خاموش تبلیغ بھی ان لوگوں کے لیے ہے جو اس راہ پر آنے سے ہچکچا رہے تھے اور اپنی اس ہچکچاہٹ کے لیے مختلف قسم کے حیلے بہانے پیدا کر رہے تھے۔

حاملین قرآن کا کردار

'اَلصّٰبِرِیْنَ الآیۃ'۔ یہ دوسرا بدل ہے۔ اس سے ان اخلاقی اوصاف کی وضاحت ہو گئی ہے جن سے یہ پاکیزہ صفات گروہ متصف ہے اور اسی سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ وہ اخلاق و کردار کن اجزا سے مرکب ہے جو قرآن کا حامل ہونے کے لیے ضروری ہے۔ یہ آیت گویا اس کے بالکل ضد اخلاق و کردار پیش کر رہی ہے جو اوپر 'زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ' والی آیت میں نمایاں ہوا۔

یہاں صرف پانچ صفات بیان ہوئی ہیں۔ صبر، صدق، قنوت، انفاق، استغفار۔

'صبر' کی حقیقت

صبر کی حقیقت نرم و گرم ہر طرح کے حالات میں حق پر جزم و استقامت ہے۔ غربت، بیماری، مصیبت، مخالفت، جنگ، غرض جس قسم کے بھی حالات سے آدمی کو دوچار ہونا پڑے عزم و ہمت کے ساتھ ان کو برداشت کرے، ان کا مقابلہ کرے، ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے اور اپنے امکان کے حد تک موقف حق پہ جما رہے۔ دل کو مایوسی اور گھبراہٹ سے، زبان کو شکوۂ تقدیر سے اور اپنی گردن کو کسی باطل کے آگے جھکنے سے بچائے۔ دین کا بڑا حصہ اسی صبر پر قائم ہے۔ اگر آدمی کے اندر یہ وصف نہ ہو تو کوئی طمع، کوئی ترغیب، کوئی آزمائش بھی اس کو حق سے ہٹا کر باطل کے آگے سرنگوں کر دے سکتی ہے۔ جو شخص سچائی کے راستے پر چلنا چاہے اور اس پر چل کر استوار رہنے کا آرزومند ہو اسے سب سے پہلے اپنے اندر صبر کی صفت پیدا کرنی چاہیے۔ مزاحمتوں کے مقابلے کے لیے (اور اس راہ میں ہر قدم پر مزاحمتوں سے مقابلہ ہے) اصلی ہتھیار بندے کے پاس یہی ہے۔ فلسفہ دین کے نقطہ نظر سے دین نصف شکر ہے اور نصف صبر، لیکن عملی تجربہ گواہ ہے کہ آدمی میں صبر نہ ہو تو شکر کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ یہاں چونکہ خطاب ان لوگوں سے ہے جنھیں سچائی کی سب سے بڑی بلندی پر چڑھنے کی دعوت دی جا رہی ہے اس وجہ سے ان کے سامنے جن لوگوں کا نمونہ پیش کیا گیا ہے ان کے کردار میں سب سے پہلے ان کے صبر ہی کے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔

'صدق' کی حقیقت

'صدق' کی اصل حقیقت کسی شے کا بالکل مطابق واقعہ ہونا ہے۔ اس کی روح پختگی اور ٹھوس پن ہے۔ نیزے کی گرہیں دیکھنے میں جیسی مضبوط ظاہر ہو رہی ہیں آزمائش سے بھی ویسی ہی مضبوط ثابت ہوں تو ایسے نیزے کو عربی میں صادق الکعوب کہیں گے۔ زبان، دل سے ہم آہنگ ہو، عمل اور قول میں مطابقت ہو، ظاہر اور باطن ہم رنگ ہوں، عقیدہ اور عمل دونوں ہم عناں ہوں، یہ باتیں صدق کے مظاہر میں سے ہیں اور انسانی زندگی کا سارا ظاہر و باطن انھی سے روشن ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کی ساری معنویت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی چیز ہے جو انسان کو وہ پر پرواز عطا کرتی ہے جس سے وہ روحانی بلندیوں پر چڑھتا ہے اور اسی سے اس کے صبر کو بھی سہارا ملتا ہے۔

'قنوت' کی حقیقت

'قنوت' کی اصل روح اللہ جل شانہ کے لیے تواضع و تذلل ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کے شعور اور اس کی بے نہایت عظمتوں کے احساس کا قدرتی ثمرہ ہے۔ یہ نعمت کو شکر کا اور مصیبت کو صبر کا ذریعہ بناتی ہے اور ہر حالت میں بندے کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ رکھتی ہے۔ اصلاً تو یہ عقل و دل کی فروتنی اور انکساری ہے لیکن جس طرح قلب کی ہر حالت کا عکس انسان کے ظاہر پر بھی نمایاں ہوتا ہے اسی طرح اس کا عکس بھی انسان کی وضع قطع، چال ڈھال، گفتار کردار ہر چیز میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ اس غرور اور گھمنڈ کی ضد ہے جو نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ سمجھنے کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس تلون اور بے صبرے پن کے بھی منافی ہے جو صبر و صدق کے فقدان سے پیدا ہوتا ہے۔

'انفاق' کی حقیقت

'انفاق' کے معنی واضح ہیں۔ یہ مرغوبات دنیا کی اس محبت کی ضد صفت ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا۔ اگر مرغوباتِ دنیا کی محبت دل پر اس طرح چھا جائے کہ وہ خدا اور بندوں کے حقوق سے انسان کو روک دے تو یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن نے "زُیِّنَ لِلنَّاسِ" سے تعبیر کیا ہے۔ انفاق کی خصلت اس امر کی شہادت ہے کہ صاحبِ انفاق کی نظر میں اصلی قدر و قیمت دنیوی خزف ریزوں کی نہیں بلکہ آخرت کی ابدی زندگی اور اس کی لازوال نعمتوں کی ہے۔ برعکس اس کے جو شخص خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے وہ اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں ساری قدر و قیمت بس اس فانی دنیا کی فانی لذتوں ہی کی ہے، آخرت کی زندگی کا اس کے ذہن میں سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

'استغفار' کی حقیقت

'استغفار' کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ سے تضرع و زاری کہ وہ اپنے بندے کی کوتاہیوں، گناہوں اور جرموں پر پردہ ڈالے۔ یہ تضرع اس حیا اور خوف کا نتیجہ ہے جو بندے کے دل میں اپنے پروردگار کے بے پایاں احسانات و انعامات کے احساس اور اس کے عدل و انتقام کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ 'وقت سحر' کی قید لگی ہوئی ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ وقت قبولیتِ استغفار کے لیے سب سے زیادہ موزوں، ریا کی آفتوں سے سب سے زیادہ محفوظ، دلجمعی اور آیاتِ الٰہی میں تفکر و تدبر کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے۔ قرآن اور حدیث دونوں ہی میں مختلف پہلوؤں سے اس کی وضاحت ہوئی ہے اور یہ رب کریم کا عظیم احسان ہے کہ اس نے استغفار کی ہدایت کے ساتھ ساتھ استغفار کی قبولیت کے لیے سب سے زیادہ سازگار وقت کا بھی خود ہی پتہ دے دیا۔

اس ٹکڑے پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو اس سے جہاں ایک طرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کن صفات کے لوگ ہیں جو قرآن کے حامل ہو سکتے ہیں وہیں یہ بات بھی اس سے نکلی کہ وہ موانع کیا ہیں جو قرآن کے ان مخالفین اور قرآن کے درمیان حائل ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان میں وہ صبر نہیں ہے جو نفس اور شیطان کی مزاحمتوں کے مقابل میں ان کو پا بر جا رکھ سکے، وہ صدق نہیں ہے جو ان کے عقیدہ اور عمل، قول اور فعل، ظاہر اور باطن میں مطابقت پیدا کر سکے، وہ قنوت نہیں ہے جو سب سے بڑے صاحبِ حق کے آگے ان کی گردن اور ان کے دل دونوں کو جھکا دے، ابدی زندگی کا وہ شوق نہیں ہے جو انھیں آخرت کے لیے دنیا کو قربان کرنے پر ابھار سکے اور خدائے منعم و دیان کی نعمتوں اور نقمتوں کا وہ شعور و احساس نہیں ہے جو انھیں غفلت کے بستروں سے اٹھا کر مناجات سحر کے لیے ان کو ان کے رب کے حضور لا کھڑا کرے ——— اور ساتھ ہی اسلوبِ بیان نے ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ آج جن لوگوں نے اس قرآن کو قبول کر لیا ہے اور اس کے پھیلانے میں اللہ کے رسول ؐ کا ساتھ دے رہے ہیں وہ ان صفات سے متصف ہیں اور ان صفات سے متصف ہونے ہی کے سبب سے وہ اس بارِ گراں کے اٹھانے کے اہل بن سکے ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۸۔۲۲

وہی اوپر والا مضمون ایک دوسری شاندار تمہید کے ساتھ ایک دوسرے پہلو سے بیان ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ، اس کے فرشتوں اور علم حقیقی کے تمام حاملین کی شہادت ابتدا سے یہی ہے کہ اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ عدل و قسط کو قائم کرنے والا اور عزیز و حکیم ہے۔ اس نے بندوں کی ہدایت اور ان کو عدل و قسط پر قائم کرنے کے لیے جو دین عطا فرمایا وہ اسلام ہے، یہی دین اللہ کا حقیقی دین ہے، یہی دین اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے بھیجا لیکن یہود و نصاریٰ نے اپنی باہمی ضد و ضد کے سبب سے دیدہ و دانستہ اس دین میں اختلافات برپا کیے اور اسلام کے بجائے یہودیت و نصرانیت کے الگ الگ بت کھڑے کر لیے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر یہود و نصاریٰ تم سے اس دین حقیقی کے باب میں جھگڑنا چاہتے ہیں تو تم ان کی اس مخالفت کو ذرا خاطر میں نہ لاؤ بلکہ صاف صاف اہل کتاب کو بھی اور قریش کو بھی سنا دو کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو اسلام کی راہ اختیار کر لی ہے، اب جس کا جی چاہے اپنی گمراہی پر اڑا رہے۔ تمہارے اوپر ذمہ داری صرف اس پیغام کو پہنچا دینے کی ہے، اس کے بعد معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ وہ سب کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے جس کو جس چیز کا سزاوار پائے گا اس کو وہ دے گا۔

آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے واسطے سے اہل کتاب کو یہ دھمکی دی ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں، جنھوں نے اللہ کے نبیوں کا خون ناحق بہایا ہے اور جو دین کے مصلحین و مجددین اور عدل و قسط کے علم برداروں کے درپئے آزار و قتل رہے ہیں، اب ان کی عدالت کا وقت آ گیا ہے، اب وہ خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکیں گے، ان کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت جائیں گے اور کوئی ان کا حامی و مددگار نہ بن سکے گا۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

آیات ۱۸۔۲۲ النصف

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ

يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

ع ۲ / ۱۰

ترجمہ آیات ۱۸-۲۲

اللہ فرشتوں اور اہل علم کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل و قسط کا قائم رکھنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ۱۸

اللہ کا اصل دین اسلام ہے۔ اہل کتاب نے تو اس میں اختلاف علم حق کے آجانے کے بعد محض باہمی ضد م ضدا کے سبب سے کیا ہے۔ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کریں گے تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ اگر وہ تم سے اس بارے میں جھگڑتے رہیں تو تم ان سے کہہ دو کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کیا اور اہل کتاب اور امیوں سے پوچھو کہ کیا تم بھی اسی طرح اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ بھی اسی طرح اسلام لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو تمہارے اوپر ذمہ داری صرف پہنچا دینے کی ہے، اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے۔ ۱۹-۲۰

جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں، نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں اور

ان لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو لوگوں میں سے عدل و قسط کی دعوت لے کر اٹھے تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت گئے اور ان کا کوئی مدد کرنے والا نہ بنے گا۔ ۲۱-۲۲

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۸)

توحید اور قسط کی شہادت کے تین پہلو

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور قائم بالقسط ہونے پر اپنی، اپنے فرشتوں اور اہل علم کی شہادت کا حوالہ دیا ہے۔ یہ شہادت تین مختلف پہلوؤں سے ہے۔

آفاق کی شہادت

ایک تو آفاق کی شہادت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کے خالق نے اس کو جس طرح بنایا ہے اور جس طرح اس کے نظام کو چلا رہا ہے اس سے اس بات کی صاف شہادت مل رہی ہے کہ وہ ایک ہی ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے۔ قرآن نے اس شہادت کو توحید کی دلیل کے عنوان سے اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اسی نظامِ کائنات سے قرآن نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے ہر گوشے میں اس کائنات کے خالق نے ایک میزان رکھی ہے، مجال نہیں کہ کوئی شے اپنے معین محور و مدار سے ایک اِنچ بھی اِدھر اُدھر ہو سکے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کا خالق و فاطر عدل و قسط کو پسند کرتا ہے، یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس عدل و قسط سے بال برابر بھی انحراف کرے۔ قرآن میں اس حقیقت کے شواہد بہت ہیں۔ ہم بخیالِ اختصار صرف ایک آیت بطورِ مثال نقل کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝ (۵-۹ رحمان)	سورج اور چاند دونوں ایک حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ تارے اور درخت سب سجدہ کرتے ہیں۔ اس نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں ایک میزان رکھی، کہ تم بھی میزان کے معاملے میں تجاوز نہ کرو بلکہ وزن کو انصاف کے ساتھ قائم کرو، اور میزان میں کوئی کمی نہ کرو۔

یعنی یہ کائنات اپنے وجود سے اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ اس کا خالق عدل و قسط کو پسند کرنے والا ہے اور اس کے سورج اور چاند، شجر و حجر، آسمان و زمین اپنی زبانِ حال سے ہر وقت یہ سبق دے

رہے ہیں کہ جس طرح وہ خدا کے مقرر کردہ پیمانے سے سر مو تجاوز نہیں کرتے، ان کی ہر حرکت اس پیمانے سے نپی تلی ہوتی ہے اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں خدا کی میزان میں نپی تلی روش اختیار کرے، اس کے ٹھہرائے ہوئے حدود سے ذرا بھی تجاوز نہ کرے۔

تاریخ کی شہادت

اسی آفاقی شہادت کے ذیل میں قوموں کی تاریخ بھی آتی ہے۔ قرآن نے قوموں کی تاریخ بھی پیش کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ اس کا خالق و مالک اس کو ایک نظام عدل و قسط کے تحت چلا رہا ہے۔ اس کے اسٹیج پر یکے بعد دیگرے وہ مختلف قوموں کو بھیجتا ہے اور ان کا امتحان کرتا ہے کہ وہ خدا کے قانون عدل و قسط کے اندر اپنے اختیار اور اپنی قوتوں کو استعمال کرتی ہیں یا اس سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کرتی ہیں۔ جب تک کوئی قوم خدا کے حدود کے اندر رہ کر اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتی ہے، وہ اس کو برومند کرتا اور پروان چڑھاتا ہے، جب وہ اس راہ سے ہٹ کر سرکشی کی راہ اختیار کر لیتی ہے تو ایک خاص حد تک مہلت دے چکنے کے بعد وہ اس کو فنا کر دیتا ہے اور دوسری قوم کو اس کی وارث بناتا ہے۔ قرآن نے اس سنت کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

انفس کی شہادت

دوسری شہادت انفس کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ خود توحید کی اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ اس شہادت کے دلائل ہم اپنی اس کتاب میں بھی جگہ جگہ بیان کر رہے ہیں اور خاص اس موضوع پر ہم نے حقیقت شرک اور حقیقت توحید کے نام سے دو کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تفصیل کے طالب ان کو پڑھیں۔ انسانی فطرت کی یہی توحید پسندی ہے جس کے سبب سے قرآن نے توحید کو دین فطرت قرار دیا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) اور یہی عدل پسندی ہے جس کی بنا پر جزا و سزا کے منکرین سے قرآن یہ سوال کرتا ہے۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ (۳۴-۳۵۔ قلم) کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے، تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟)

وحی کی شہادت

تیسری شہادت وحی کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پسند ناپسند اور اپنے اوامر و نواہی سے بندوں کو آگاہ کرنے کے لیے اپنے بے شمار نبی اور رسول بھیجے اور ان سب پر اپنی توحید اور اپنے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی اور ان نبیوں اور رسولوں نے یہ شہادت اپنی اپنی امتوں کو پہنچائی۔ اس شہادت کے آثار و نشانات آج بھی ان امتوں کی روایات اور ان کے صحیفوں کی تعلیمات میں موجود ہیں لیکن انھوں نے ان آثار و روایات کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو ایسے نظریات و عقاید میں مبتلا کر لیا جو توحید کے بھی منافی ہیں اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کے بھی لیکن ان امتوں کی اس غلط روش کی وجہ سے وہ اپنی ان اعلیٰ صفات سے دستبردار نہیں ہو گیا ہے بلکہ وہ بدستور ان سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا۔ چنانچہ انھیں صفات کا یہ تقاضا ہے کہ اس نے قرآن کو، جیسا کہ اوپر کی تمہید میں گزرا، حق و باطل کے درمیان فرقان

بنا کر اتارا تاکہ حق و عدل کی صراطِ مستقیم پھر واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے اور باطل پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ خدا کی وحدانیت اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت کسی ایک ہی پہلو سے نہیں مل رہی ہے بلکہ تین مختلف پہلوؤں سے مل رہی ہے۔ اس کی بنائی ہوئی کائنات کا نظام اور اس کی تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے، اس کی پیدا کی ہوئی فطرت اس پر گواہ ہے اور اس کے پیغمبروں نے ہمیشہ اس حقیقت کی منادی کی ہے۔ اس آیت میں یہ بات نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کے تیس پاروں میں اس اجمال کی تفصیلات پھیلی ہوئی ہیں۔

ملائکہ کی شہادت

اللہ تعالیٰ نے اپنی شہادت کے ساتھ یہاں ملائکہ کی شہادت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ ایک امرِ واقعی کا اظہار و بیان ہے، کائنات میں خدا کے ارادوں کے نفاذ کا ذریعہ اور خدا کے پیغمبروں تک اس کی وحی پہنچانے کا واسطہ ملائکہ ہی بنتے ہیں اس وجہ سے خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کے اس کی مخلوقات میں شاہدِ اول وہی ہیں۔ ان کی گواہی ایک امرِ واقعی ہونے سے قطعِ نظر اس پہلو سے بھی خاص طور پر بیان ہوئی کہ نادانوں نے ان کو خدا کا شریک اور شفاعتِ باطل کا واسطہ قرار دے کر توحید کی بھی نفی کی اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کی بھی۔ اس لیے کہ جب تصور یہ ہو کہ سفارش حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دے سکتی ہے تو پھر خدا قائم بالقسط کہاں رہا؟ فرشتوں کے متعلق اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے قرآن نے خود ان کی زبان سے بھی جگہ جگہ ان کے اعترافات کا حوالہ دیا ہے۔ ہم بخیالِ اختصار صرف ایک مثال نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿﴾ وَ	اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک متعین مقام
اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ	ہے اور ہم تو صفیں باندھ کر حاضر رہنے والے ہیں اور
الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿﴾ (۳۷: ۱۶۴-۱۶۶ - صافات)	ہم تو اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔

فرشتوں سے متعلق ایک تفصیلی بحث سورۂ بقرہ میں بضمن آیت ایمان ہم کر چکے ہیں۔

اولوا العلم کی شہادت

ملائکہ کے بعد اولوا العلم کی شہادت کا ذکر ہے۔ العلم قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد وہ علمِ حقیقی ہوتا ہے جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے دنیا کو ملا ہے۔ اس پر مفصل بحث ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ اس علم کے حاملین نے ہر دور میں خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی ہے یہ مصلحین و مجددین کے گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں اور جنھوں نے اللہ کے دین کو بدعات اور آمیزشوں سے پاک کر کے عقاید کو توحیدِ خالص کی بنیاد پر اور شرائع و قوانین اور اعمال و اخلاق کو حق و عدل کی اساس پر استوار کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کی طرف آگے کی آیت میں یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ کے لفظ سے اشارہ ہوا ہے اور جن کے متعلق فرمایا ہے کہ اہلِ کتاب ان کو قتل کرتے رہے ہیں۔

حکمتِ دین کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ اور ملائکہ کے ساتھ حاملین علم کا حوالہ ہے اور توحید کے ساتھ عدل و قسط کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں اہلِ علم کا کیا مقام ہے اور خدائی شریعت کے نظام میں عدل و قسط کا کیا درجہ و مرتبہ ہے۔ علمِ حقیقی کے حاملین ملائکہ کے زمرے سے نسبت رکھنے والے ہیں اور عدل و قسط کا درجہ صفاتِ الٰہی میں اتنا بلند و ارفع ہے کہ توحید کے بعد سب سے پہلے جس کا ذکر ہو سکتا ہے وہ یہی ہے۔

"قسط" کا مفہوم

" قَآئِمًا بِالْقِسْطِ " ترکیب کے لحاظ سے ہمارے نزدیک " اَنَّہٗ " کی ضمیر سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد و یکتا ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں، تمام اختیار و تصرف تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس اختیار و تصرف کو ٹھیک ٹھیک عدل و قسط کے مطابق استعمال کر رہا ہے۔

"قسط" کا مفہوم وہی ہے جو ہم عام بول چال میں حق، عدل، انصاف، وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس کا ضد ظلم، جور اور اس معنی کے دوسرے الفاظ ہیں۔ فکر، عمل، قول، اخلاق، کردار، مظاہر اور اشکال غرض ظاہر و باطن کے ہر گوشے میں ایک نقطہ تو وہ ہے جو ہر چیز کے خالق و فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود و قیود کے اندر ہے، اس کو نقطۂ اعتدال یا بالفاظِ دیگر مرجع عدل و قسط سمجھیے۔ اگر کسی گوشے میں اس نقطہ سے شوشے کے برابر بھی انحراف واقع ہو جاتے تو یہ بات عدل و قسط کے منافی ہو گی۔ اعتبارات اور نسبتوں کی تبدیلی سے تعبیرات بدل بدل جائیں گی۔ کسی دائرے میں ہم اس انحراف کو ظلم و جور سے تعبیر کریں گے، کسی گوشے میں بدصورتی اور بدہئیتی سے، اسی طرح کسی پہلو میں اس اعتدال کو حق و عدل سے تعبیر کریں گے، کسی محل میں حسن و جمال سے لیکن اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہو گی۔ وہ یہ کہ ایک شے اپنے اصل فطری مقام سے ہٹ گئی تو بگاڑ پیدا ہو گیا اور اگر اپنے جوڑ سے پیوست ہو گئی تو بناؤ نمودار ہو گیا۔

خالقِ کائنات چونکہ اس دنیا کا خالق و مالک ہے اس وجہ سے اس کو اس کا بگاڑ نہیں بلکہ بناؤ مطلوب ہے۔ اس کے نظامِ تکوینی کی اس نے اس طرح چول سے چول بٹھائی ہے کہ مجال نہیں کہ کہیں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے اور اگر اس کی قدرت ہی کی کسی معجز نمائی سے کہیں کوئی رخنہ پیدا ہوتا نظر آتا ہے تو دفعتًہ اسی کے کارفرما ہاتھ اس کو درست کرنے کے لیے نمودار ہو جاتے ہیں تاکہ جس توازن پر یہ کارخانہ قائم ہے اس میں کوئی خلل نہ پیدا ہونے پائے۔ اس کی یہی توازن پسندی ہماری زندگی کے اس دائرے کے لیے بھی ہے جس دائرے میں اس نے ہمیں محدود قسم کی آزادی دی ہے۔ جب ہم اپنے اختیار کو غلط استعمال کر کے اپنے اخلاق و عمل کے کسی گوشے میں فساد پیدا کر لیتے ہیں تو وہ ہمیں ڈھیل تو دیتا ہے لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے، اس کی عدل پسندی یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ ہمیں ہماری خواہشات کی پیروی کے لیے آزاد اور اس کے نتیجے میں اپنی خلق کو تاراج و پامال ہونے کے لیے چھوڑ دے بلکہ وہ اس ڈھیل پر گرفت

کرتا ہے اور ہمارے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کو ازسرِنو درست کر دیتا ہے اس لیے کہ وہ قائم بالقسط ہے۔

اس قیام بالقسط ہی کے لیے اس نے مکافاتِ عمل کا قانون رکھا ہے، اسی کے لیے اس نے انبیا و شرائع کے بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا، اسی کے لیے اس نے یہ اہتمام فرمایا کہ جب شریعت میں تحریفات و بدعات سے فساد پیدا ہو جائے تو مجددین و مصلحین اس کی اصلاح و تجدید کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں، اسی کی خاطر اس نے قوموں کے عروج و زوال کو ان کے اخلاقی عروج و زوال کے تابع کیا اور پھر سب سے بڑھ کر اس عدل و قسط ہی کے کامل ظہور کے لیے اس نے ایک ایسا دن مقرر کیا ہے جس میں اس کی میزانِ عدل نصب ہوگی اور وہ تول کر بتائے گی کہ کس کا کون سا عمل ترازو میں پورا ہے، کون سا نہیں، اور پھر اسی کے مطابق جزا و سزا ہوگی۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ ایک ہی آیت میں دو مرتبہ کلمہ توحید کا اعادہ ہے اور دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دو الگ الگ صفتوں کا حوالہ ہے۔ پہلے فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ قائم بالقسط ہے پھر فرمایا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عزیز و حکیم ہے۔ اس اسلوب میں مخاطب اہلِ کتاب کے لیے سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا، فرشتوں اور تمام حاملینِ علم کی شہادت یہی ہے کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور وہ الٰہ امورِ دنیا سے بے تعلق نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کی خواہشات کی چراگاہ میں شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے، وہ دندناتے پھریں اور وہ حی و قیوم ہونے کے باوجود ان کا کوئی نوٹس نہ لے بلکہ وہ تمہاری خواہشوں کے علی الرغم اپنے نظامِ عدل و قسط کو ضرور قائم کرے گا اور کوئی اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکے گا۔ پھر فرمایا کہ وہ ایسا کیوں نہ کرے گا جب کہ وہ وحدہٗ لاشریک بھی ہے اور عزیز و حکیم بھی۔ اس کی عزت اور حکمت دونوں کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یا تو وہ بے بس اور حق کے لیے غیرت سے خالی ہے یا وہ ایک کھلنڈرا ہے جس نے دنیا کو محض ایک کھیل تماشا بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی عظیم ہستی کے متعلق اس قسم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۱۹)

"الدِّين" سے مراد دینِ حقیقی، یعنی وہ دین جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے اتارا۔ اس پر الف لام اسی طرح کا ہے جس طرح کا "الکتٰب" پر ہے۔ اس کی وضاحت تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم کر چکے ہیں۔

"الْعِلْمُ" سے مراد علمِ حق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کو واضح کرنے اور اختلاف کو دور کر دینے کے لیے نازل ہوا۔

دینِ اسلام ہی اللہ کا دین ہے

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ عدل و قسط کو قائم کرنے والا ہے اس وجہ سے اس نے بندوں کو صحیح

زندگی گزارنے کا طریقہ بتانے کے لیے ایک دین عطا فرمایا جس کا نام اسلام ہے۔ یہی دین اللہ کا دین ہے
یہ دین عدل و قسط کی میزان ہے۔ یہی دین اس کائنات کے تمام نظامِ تکوینی میں نافذ ہے۔ اسی دین پر
فطرتِ انسانی کی تخلیق ہوئی ہے۔ یہی دین اس نے ابتدا سے تمام نبیوں اور رسولوں پر اتارا۔ اس سے الگ
اس نے کسی کو کوئی اور دین نہیں دیا لیکن یہود و نصاریٰ نے باہمی اختلاف و عناد اور ضدم ضدا کی وجہ
سے اس میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے اور یہودیت و نصرانیت کے ناموں سے اپنے الگ الگ
دین کھڑے کر لیے۔ ان کا یہ اختلاف کسی بے خبری پر مبنی نہیں تھا بلکہ حق واضح ہو جانے کے باوجود محض
شرارتِ نفس، باہمی عناد اور اپنی اپنی بدعات کی پچ میں تھا۔ اس طرح انھوں نے اللہ کی عظیم نعمت پا
کر ضائع کر دی۔ اللہ چونکہ حی و قیوم اور قائم بالقسط ہے اس وجہ سے اس نے اس نظامِ عدل و قسط یعنی
اسلام کو از سرِ نو تازہ اور مکمل صورت میں نازل فرمایا تاکہ لوگ ہدایت کی صراطِ مستقیم پائیں اور دنیا و آخرت
دونوں کی فلاح حاصل کریں۔ اب بھی اگر انھوں نے وہی روش اختیار کیے رکھی جو اس سے پہلے اختیار
کی اور خدا کی آیتوں کا انکار کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا حساب بہت جلد چکا دینے
والا ہے۔ یعنی یہ مہلت جو انھیں ملی ہوئی ہے اس کو بہت طویل نہ سمجھیں بلکہ حضرت یحییٰؑ کے لفظوں میں
یوں سمجھیں کہ درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے۔

یہ مضمون سورہ بقرہ میں بھی آچکا ہے اور وہاں ہم تفصیل کے ساتھ اس پر گفتگو کر چکے ہیں۔ ہم آیت نقل کیے دیتے ہیں۔ تفصیل کے طالب اسی مقام میں اس کی تفسیر دیکھیں۔ فرمایا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۱۳- بقرہ)

لوگوں کو اللہ نے ایک ہی امت بنایا۔ پھر انھوں نے اختلافات پیدا کیے تو اللہ نے اپنے انبیا بھیجے خوش خبری دیتے ہوئے اور آگاہ کرتے ہوئے اور ان کے ساتھ کتاب اتاری حق کے ساتھ تاکہ لوگوں کے درمیان ان کے اختلافات کا فیصلہ کرے۔ اور اس میں اختلاف انھی لوگوں نے کیا جن کو یہ کتاب ملی، کھلی کھلی تنبیہات کے باوجود، محض آپس کی ضدم ضدا کے سبب سے، تو اللہ نے ایمان لانے والوں کو اپنی توفیق بخشی سے اس حق کی ہدایت دی جس میں ان لوگوں نے اختلاف کیا اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ

الْأُمِّيِّينَ ءَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (۲۰)

"اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ" (میں نے اپنا چہرہ اللہ کے حوالے کیا) اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کرنے کی تعبیر ہے۔ چہرہ انسان کی ذات کا سب سے اعلیٰ واشرف حصہ ہے۔ جب سب سے اعلیٰ واشرف حصہ حوالے کردیا تو گویا سب کچھ حوالے کردیا۔ یہ اسی طرح کی تعبیر ہے جس طرح ہم کسی کی اطاعت کی تعبیر کے لیے سر جھکا دینا بولتے ہیں۔ اس تعبیر میں غایت درجہ تذلل و نیازمندی اور سپردگی پائی جاتی ہے۔ موقع دلیل ہے کہ یہاں یہ اسلوب اصلاً تو اسلام لانے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اس سے اسلام کی اصل روح بھی واضح ہوگئی ہے تاکہ دینداری کے ان مدعیوں کو، جو اسلام کی مخالفت میں بحث و جدال کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے تھے، تنبیہ ہو کہ وہ کس چیز کے خلاف یہ زور دکھا رہے ہیں۔

'اُمّی' کا مفہوم

'اُمّی' مدرسی و کتابی تعلیم و تعلّم سے ناآشنا کو کہتے ہیں۔ 'اُمّیّین' کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے اور اس طرح بنی اسرائیل کے بالمقابل، جو حاملِ کتاب تھے، اُمّیت ان کے لیے ایک امتیازی علامت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ عربوں کے لیے اس کے استعمال کا آغاز اہلِ کتاب سے ہی ہوا ہو اس لیے کہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریت کی بدویت و امیت کا ذکر تورات میں بھی ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس لفظ کے استعمال میں عربوں کے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ چنانچہ قرآن نے اس لفظ کو عربوں کے لیے ان کو اہلِ کتاب سے محض ممیز کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے 'نبی امی' کا لقب استعمال ہوا ہے۔ اس میں تورات کی پیشین گوئیوں کی ایک تلمیح بھی ہے۔ عرب خود بھی اس لفظ کو اپنے لیے استعمال کرتے تھے، جو اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ اس میں اپنے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں پاتے تھے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی قوم کے لیے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، مثلاً وہ حدیث جس میں ارشاد ہوا ہے نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ الحدیث بعض جگہ اگر یہ لفظ تحقیر کے طور پر استعمال ہوا ہے تو وہاں اس کا مفہوم محض لغوی ہے اصطلاحی نہیں مثلاً وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الآیۃ) اس سے مراد یہود کے اَن پڑھ عوام ہیں۔

"ءَاَسْلَمْتُمْ" (کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟) یہ اسلوب دھمکی اور دعوت دونوں پر مشتمل ہے بلکہ فی الجملہ اس سے بیزاری کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ یعنی تم کو بھی اسلام لانا ہے تو لاؤ، ہم اپنا وقت اب تمہارے ساتھ مناظرہ بازی میں ضائع کرنا نہیں چاہتے، ہم نے تو اپنی راہ اختیار کرلی ہے، اب اپنی منزل کھوٹی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے جس وقت اللہ کے دین۔ اسلام۔ کو یہودیت و نصرانیت کی صورت میں مسخ کیا جان بوجھ کر مسخ کیا اور اب جو یہودیت و نصرانیت کی حمایت اور اسلام کی مخالفت میں یہ تم سے مناظرہ و مباحثہ چھیڑے ہوتے ہیں یہ بھی جان بوجھ کر رہی ہے۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ حق کیا ہے اور تم جس دین کی دعوت دے رہے ہو اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس وجہ سے ان کے ساتھ بحث و جدال میں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان سے بھی اور اُمّی عربوں سے بھی کہہ دو کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دیا اور اسلام کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیا اگر تم بھی اس بازی کے لیے تیار ہو تو بسم اللہ آگے بڑھو اور اگر تیار نہیں تو ہماری راہ چھوڑو، اب تمھارے پیچھے ہم اپنی اوقات رائیگاں کرنا نہیں چاہتے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اگر یہ اسلام کی راہ اختیار کرتے ہیں تو اور اگر یہ راہ نہیں اختیار کرتے بلکہ اپنی حماقتوں پر جمے رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو، تمھارے اوپر ذمہ داری صرف حق کو پہنچا دینے کی تھی، وہ ذمہ داری تم نے ادا کر دی، اب تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو۔ اب ان کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اپنے بندوں کے سارے حالات و معاملات کو دیکھ رہا ہے اور ہر ایک کے ساتھ وہ وہی معاملہ کرے گا جس کا اس کو مستحق پائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۲۱)

قتل انبیاء بغیر حق

'يَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ' میں بغیر حق کے الفاظ سے ایک تو یہود کے اس جرم کی سنگینی کا اظہار ہو رہا ہے، کیونکہ قتل ناحق بجائے خود ایک سنگین جرم ہے اور اگر یہ قتل ناحق کسی نبی کا ہو تو پھر تو اس کی سنگینی کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ دوسرے اس سے حق کی عظمت کا اظہار ہو رہا ہے کہ حق سب سے بالاتر چیز ہے یہاں تک کہ انبیا بھی اس کے تحت آتے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے فرمایا ہے۔

آمرین بالقسط سے مراد

'الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ' سے مراد وہ مصلحین و مجددین ہیں جو عام لوگوں کے اندر سے اٹھے اور جنھوں نے یہود و نصاریٰ کی تحریفات و بدعات کی اصلاح اور ان کی زندگیوں کو از سرِ نو خدا کے دیے ہوئے نظامِ حق و عدل کے تحت لانے کی جد و جہد کی ان لوگوں کے ساتھ بھی یہود و نصاریٰ نے وہی معاملہ کیا جو خدا کے نبیوں کے ساتھ کیا۔ اپنے تمام حربوں سے کام لے کر ان کی مخالفت کی اور جس پر بس چل گیا اس کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اوپر والی آیت کے آخر میں یہ جو فرمایا تھا کہ اللہ اپنے بندوں کا نگران حال ہے، ہدایت و ضلالت میں سے جس کو جس چیز کا سزاوار پائے گا اس کو وہی بخشے گا، اب یہ اس کے مضمرات کھل رہے ہیں مطلب

یہ ہے کہ جن لوگوں کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے رہے ہیں، جو اللہ کے نبیوں کو قتل کرتے رہے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو ان کے اندر اصلاح و تجدید اور حق و عدل کی دعوت لے کر اٹھے یہ کس طرح ممکن ہے کہ آج ان کا مزاج بدل جائے۔ جس نظامِ حق و عدل کو انھوں نے ہمیشہ بگاڑا اور اس کی اصلی بنیادوں پر قائم کرنے والوں کے یہ درپئے آزار بھی رہے اور ان کو قتل بھی کیا اسی نظامِ عدل اور اس کے داعیوں کو آج وہ کس طرح گوارا کریں گے؟ جب اخلاف اپنے اسلاف ہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں تو انبیاء اور مصلحین کے قاتلوں اور تورات و انجیل کے محرفوں کی اولاد سے یہ کس طرح توقع رکھتے ہو کہ وہ تم کو اور تمھاری پیش کی ہوئی کتاب کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کریں گے۔ انجیل میں جگہ جگہ سیدنا مسیح نے قاتلینِ انبیا کی اولاد کے ایمان اور ان کی نجات سے جو مایوسی کا اظہار فرمایا ہے وہ بھی بالکل اسی موقع کی بات ہے۔ بعینہٖ وہی بات قرآن نے یہاں اپنے اسلوب میں کہی ہے کہ یہ لوگ ایمان و اسلام کی راہ اختیار کر کے نجات و فلاح کی خوشخبری کے اہل نہیں ہیں۔ بس انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (۲۲)

'حبطِ عمل' کی حقیقت

'حبطِ عمل' سے مطلب ہے کوششوں اور محنتوں کا اکارت ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ وہ ساری دینداریاں جو سیدنا مسیح کے الفاظ میں، مچھر کو چھاننے اور اونٹ کو نگلنے کے مترادف تھیں ان کے آخرت میں نتیجہ خیز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہیں وہ کوششیں اور تدبیریں جو وہ قرآن و اسلام یا دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل و قسط کی مخالفت میں صرف کر رہے تھے تو اس آیت نے ان کے بھی اکارت ہونے کی پیشین گوئی کر دی اس لیے کہ اس آیت میں دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے اعمال کے اکارت ہونے کا ذکر ہوا ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اس ذلت و نامرادی سے بچانے میں ان کا کوئی مددگار ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ خواہ یہ مددگار روحانی ہوں یا مادی۔ تاریخ گواہ ہے کہ قرآن کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

۶۔ ایمان بالقسط ایمان کے اہم ارکان میں سے ہے

اس مجموعہ آیات میں جو تعلیم امت کو دی گئی ہے آیات کی وضاحت کے ضمن میں بقدرِ ضرورت ہم اس پر روشنی ڈال چکے ہیں لیکن ایمان باللہ کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کی صفت کا جو حوالہ ہے یہ ایمان کے نہایت اہم اجزا میں سے ہے اور اسلام کی حقیقت میں تو اس کو اس درجہ دخل ہے کہ گویا اسلام عبارت ہی اسی سے ہے۔ اس کی یہ اہمیت تقاضا کر رہی ہے کہ اس کے متعلق استاذ امامؒ کے چند نکات یہاں درج کر دیے جائیں تاکہ جو لوگ حکمتِ دین پر غور کرنا چاہتے ہیں وہ ان سے فائدہ اٹھا

سکیں۔ مولاناؒ کے نزدیک اس صفت کی اہمیت مندرجہ ذیل پہلوؤں سے ہے۔

ایمان بالقسط کی اہمیت کے چار پہلو

۱۔ ایمان امن سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اعتماد و اعتقاد اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ایمان کے لیے ناگزیر ہے کہ آدمی کو اللہ کے وجود پر یقین راسخ ہو۔ لیکن یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک یہ اعتماد نہ کیا جائے کہ عقل اصلاً رہنمائی کے لیے بنی ہے نہ کہ گمراہ کرنے کے لیے، یعنی یہ مانا جائے کہ عقل اپنی فطرت کے لحاظ سے انسان کے اندر ایک میزان قسط ہے۔ پھر یہ چیز ایک اور نتیجہ کو مستلزم ہے کہ فطرت کو اس کے فاطر نے حق و عدل کے اصولوں پر استوار کیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بہمہ وجوہ عدل و قسط، عدل و قسط کو پسند کرنے والا اور اس کو قائم کرنے والا ہے۔ یہ تمام نتائج عقلاً لازم بلکہ بدیہیات میں سے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حق ہونے کا ثبوت اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک فاطر فطرت کو حق و عدل نہ مانا جائے۔ اسی سے اس کے تمام افعال کا حق و صدق ہونا ثابت ہو گا۔ جس طرح عقلاً یہ چیز لازم ہے اسی طرح اخلاقی مسلمات سے بھی اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نیکی کو اللہ تعالیٰ نے فطرت میں داخل کیا ہے اور دلوں میں اس کے قبول کرنے اور اس کی عزت کرنے کی رغبت ودیعت فرمائی ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم خود تو نیکی کو پسند کریں اور خدا کو نیکی کو پسند کرنے والا نہ قرار دیں۔ ہم اپنی اس خیر پسندی کی صحت و اصابت پر اطمینان کس طرح کر سکتے ہیں اگر خود فاطر کی خیر پسندی پر ہمارا دل مطمئن نہ ہو۔ ہم اس کو نیکی کر کے خوش کرنا تو اسی وجہ سے چاہتے ہیں کہ ہم یہ اطمینان رکھتے ہیں کہ وہ نیکی کو پسند کرتا ہے۔ اس کو اچھی صفات سے موصوف کرنا بھی اسی بنیاد پر ہے کہ ان صفات کو پسند کرنے کے معاملے میں ہمیں اپنی فطرت کے صحیح ہونے پر پورا اعتماد ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ ایمان کی اصل خدا کی محبت ہے۔ ہم ایک ایسے معبود پر ایمان رکھتے ہیں جس سے ہم محبت کرتے ہیں، جس سے امید رکھتے ہیں اور جس کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ یہ چیز اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک ہمیں یہ یقین نہ ہو کہ وہ ظلم و ناانصافی کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ وہ اپنا انعام انھی پر فرمائے گا جو اس کی اطاعت کریں گے اور سزا انھی کو دے گا جو اس کے مستحق ٹھہریں گے۔ کسی ظالم و نامنصف آقا سے محبت کرنا انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات پر غور کرنے سے فطرت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا جو تقاضا ابھرتا ہے اس کی بنیاد شکر پر ہے۔ یہ شکر اس صورت میں لازم ہوتا ہے جب ہم یہ مانیں کہ یہ منعم کا حق اور اس کے انعام کا مقتضا ہے۔ یہی رمز ہے کہ قرآن میں شرک کو ظلم اور ایمان کو شکر قرار دیا گیا ہے۔ اسی اصول پر تمام حقوق کے استحقاق کی بنیاد عدل کے وجوب پر رکھی گئی ہے۔ یہ شریعت اور قانون کی ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس وجہ سے ہر شریعت کی اساس و بنیاد قسط ہے۔

۴۔ چوتھا یہ کہ ایمان کا ثمرہ اطاعتِ الٰہی ہے اور اطاعت کا ثمرہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر گوشے میں افعال اور ان کے اثرات میں یہ رشتہ اپنے خلق و تدبیر اور اپنے امر و حکم سے قائم کر رکھا ہے اور مختلف طریقوں سے اس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور ہم چونکہ اعمال کے ان نتائج پر پورا اعتماد رکھتے ہیں اس وجہ سے اس کے وعدے پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر اس بات پر ہمارا ایمان نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کر سکتا تو تمام اعمال کی بنیاد ہی ڈھے جائے گی اور پھر سارا اعتماد دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز پر رہ جائے گا یا تو نصاریٰ کی طرح جھوٹی شفاعت پر جن کا سارا اعتماد حضرت مسیحؑ پر ہے، جن کو معبود بنا کر وہ ان کی عبادت کرتے اور جن سے خدا سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں یا پھر یہود کی طرح کامل سرگشتگی اور ناعاقبت بینی پر۔ انھوں نے ہوا کے رُخ پر اپنی کشتی چھوڑ دی، اپنے تکبر اور حسد کے سبب سے وہ خدا کے فیصلے پر راضی نہ ہوئے گویا ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک اور بد میں امتیاز کے لیے کوئی ضابطہ ہی نہیں ہے۔ اس ضلالت سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس بات پر پورا یقین رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ قائم بالقسط ہے، اس کا ہر حکم عدل اور اس کا ہر وعدہ سچا ہے۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے۔ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا

ان چاروں پہلوؤں پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ ایمان بالقسط ایمان کے نہایت اہم ارکان میں سے ہے اور اس پر عقاید، اخلاق اور شرائع کے نہایت بنیادی مسائل مبنی ہیں۔

۷۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۳-۲۷

پہلے ان منکرین قرآن کی حالت پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان سے توقع تو اس بات کی تھی کہ جس کتاب کا ایک حصہ ان کو دیا گیا تھا لیکن اپنی بدبختی سے اس کو انھوں نے ضائع کر دیا اس کو از سر نو اس کی مکمل صورت میں پا کر اس کی قدر کریں گے اور اس کی روشنی میں اپنے تمام اختلافات رفع کر کے نئے سرے سے عدل و حق کی راہ اختیار کریں گے لیکن انھوں نے حسبِ عادت اعراض ہی کی روش اختیار کی۔

اس کے بعد ان کے اس اعراض کے ایک نہایت اہم سبب کا سراغ دیا ہے کہ یہ اپنے آپ کو ایک برگزیدہ امت سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط عقیدہ ایجاد کر بیٹھے ہیں کہ یہ دوزخ کے عذاب سے ہر شکل محفوظ ہیں، اول تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس سرسری طور پر کچھ سزا بھگت کر اس سے نجات پا جائیں گے۔ یہ عقیدہ ان کی ایک من گھڑت ایجاد ہے جس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اسی خود فریبی نے ان کو ان کے دین سے بالکل غافل کر دیا ہے حالانکہ ایک دن

رتی رتی کا حساب ہونا ہے۔ اس دن ان کی آنکھیں کھلیں گی کہ ان کا سارا کیا دھرا ان کے سامنے موجود
ہے اور خدا کی میزان نے نہ ان کے ساتھ کوئی رعایت کی ہے اور نہ کوئی کمی۔

اس کے بعد اس امر کا اعلان ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ اب منصب امامت سے معزول ہوئے اور
شریعتِ الٰہی کی یہ امانت اس امت کے سپرد کی جا رہی ہے جس کو خدا نے اس امانت کا اہل پایا ہے۔
مالک الملک خدا ہی ہے، وہ جس سے چاہے چھینے اور جس کو چاہے بخشے، عزت اور ذلت سب اسی
کے ہاتھ میں ہے، رات کو دن میں داخل کرنا اور زندہ کو مردہ سے نکالنا اسی کا کام ہے۔ یہ بات خبر کے
بجائے دعا کے اسلوب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے واسطہ سے آپؐ کے صحابہؓ کو تلقین کی
گئی ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بارِ گراں اب جن کے کندھوں پر ڈالا جا رہا ہے
وہ اس کو خدا کی امانت سمجھیں اور اس کے اٹھانے میں اسی کے سہارے کے طالب بنیں۔ اب اس روشنی
میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۷-۲۳

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَٰبِ يُدْعَوْنَ
إِلَىٰ كِتَٰبِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَ
هُم مُّعْرِضُونَ ﴿۲۳﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ
أَيَّامًا مَّعْدُودَٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۲۴﴾
فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللَّهُمَّ مَٰلِكَ
الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَآءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَآءُ
وَتُعِزُّ مَن تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَآءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ إِنَّكَ
عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۶﴾ تُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ
فِي الَّيْلِ ۖ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۖ
وَتَرْزُقُ مَن تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

ترجمۂ آیات ۲۳-۲۷

ذرا ان کو تو دیکھو جن کو کتابِ الٰہی کا ایک حصّہ عطا ہُوا، ان کو اللہ کی کتاب ہی کی طرف دعوت دی جا رہی ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ پھر ان کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور یہ منہ پھیر لینے ہی والے لوگ ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ بس گنتی کے چند دن چھوئے گی۔ یہ جو کچھ گھڑتے رہے ہیں اس نے ان کو ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ اس وقت کیا ہوگا جب ہم ان کو ایک ایسے دن کے لیے اکٹھا کریں گے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے اور ہر جان کو جو اس نے کمائی کی ہوگی پوری کی جائے گی، ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ۲۳-۲۵۔

دعا کرو، اے اللہ، بادشاہی کے مالک، تو ہی جس کو چاہے بادشاہی دے، جس سے چاہے بادشاہی چھینے اور تو ہی جس کو چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلّت دے، تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو، رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور ظاہر کرتا ہے مردہ کو زندہ سے اور تو جس پر چاہتا ہے اپنا بے حساب فضل کرتا ہے۔ ۲۶-۲۷

۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۳)

اَلَمْ تَرَ کے خطاب کی نوعیت

اَلَمْ تَرَ کے خطاب پر ہم سورہ بقرہ میں لکھ چکے ہیں، ہر جگہ اس کو واحد کے معنی میں لینا صحیح نہیں ہے، اس کا خطاب جماعت سے بھی ہوتا ہے، گویا فرداً فرداً جماعت کا ہر فرد مخاطب ہوتا ہے پھر یہ محض ایک سادہ خطاب ہی نہیں ہے بلکہ یہ فی الجملہ اظہارِ تعجب کا مفہوم بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں نسبت جزو کل کی ہے

'نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ' سے مراد تورات اور انجیل وغیرہ ہیں اور کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ جس طرح پچھلے آسمانی مذاہب اور شریعتِ اسلامی میں نسبت جزو اور کل کی ہے اسی طرح دوسرے آسمانی صحیفوں اور قرآن میں بھی نسبت جزو اور کل کی ہے۔ اللہ کی شریعت انسانی ذہن اور انسانی معاشرہ کے تدریجی ارتقا کے لحاظ سے درجہ بدرجہ عطا ہوتی ہے۔ جب تک انسان، کامل شریعت اور کامل کتاب کا اہل نہیں ہوا تھا اس وقت تک اس کو کامل شریعت اور کامل کتاب نہیں دی گئی بلکہ اس کے حالات اور اس کی ضروریات کے مطابق کتاب دی گئی لیکن یہ کتاب اصلاً اس کامل شریعت اور اس کامل کتاب ہی کا ایک حصہ تھی جو اس کے لیے پہلے سے خدا کی اسکیم میں مقرر تھی۔ انبیائے بنی اسرائیل نے جو تعلیم دی وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے کوئی الگ چیز نہیں بلکہ اسی تعلیم کا اتنا حصہ تھا جو ان کے دور اور ان کے حالات کے لیے موزوں تھا۔ اسی طرح تورات اور انجیل قرآن مجید سے کوئی الگ چیز نہیں ہیں بلکہ اسی صحیفۂ کامل کے یہ وہ اوراق تھے جو آخری امت سے پہلے کی امتوں کے لیے نازل ہوئے۔ اس طرح گویا تمام آسمانی کتابیں ایک ہی کتابِ الٰہی کے مختلف حصے اور مختلف ابواب کی حیثیت رکھتی ہیں، اصلاً اور فطرتاً ان میں کامل ہم آہنگی و ہم رنگی ہے۔ اگر تورات اور انجیل میں ملاوٹ اور تحریف نہ واقع ہوئی ہوتی تو ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں اجمال و تفصیل اور آغاز و تکمیل کے سوا کوئی فرق نظر نہ آتا تاہم آج بھی ایک صاحب نظر آسانی سے یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ سب صحیفے ایک ہی مشکوٰۃِ علم و معرفت کے انوار اور ایک ہی شجرۂ طوبیٰ کے برگ و بار ہیں۔ اس باہمی یک رنگی کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے جو تورات و انجیل کو جانتے اور مانتے ہوں قرآن کا پہچاننا کچھ مشکل نہ تھا بشرطیکہ انھوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب اور ضد کی پٹیاں نہ باندھ رکھی ہوتیں۔ جس کتاب کے ابتدائی ابواب انھوں نے پڑھے ہوں، جس کے انداز، اسلوب اور مزاج سے آشنا ہوں، جس کی ہدایات و تعلیمات کا ابتدائی عکس اور خاکہ انھوں نے دیکھا ہو جس کی پیشین گوئیوں سے وہ باخبر اور ان کے مصداق کے وہ منتظر ہوں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کتاب عزیز جب اپنے اصلی جمال و کمال کے روپ میں نمایاں ہو تو وہ اس کو نہ پہچان سکیں۔ پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اہل کتاب نے اس سے منہ موڑا اور جان کر اس سے انجان بن گئے!

قرآن کی ضرورت رفع اختلافات کے پہلو سے

'لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ' یہ قرآن کا وہ مقصد بیان ہوا جو اہل کتاب کو، اگر وہ اللہ کی شریعت کے قدردان ہوتے تو بہت عزیز ہونا تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل اتاری تھیں لیکن انھوں نے ان میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو فرقان بنا کر اتارا تاکہ یہ تمام اختلافات کا فیصلہ کر کے اصل حق کو پھر واضح کر دے۔ اسی بات کو یہاں پھر دہرایا ہے کہ اس کتاب کی طرف جو ان کو بلایا جا رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس میں بلانے والے کا کوئی فائدہ ہے بلکہ سراسر انھی کا فائدہ ہے۔ ان کو اس لیے بلایا جا رہا ہے کہ خدا کی شریعت میں انھوں نے جو اختلافات

پیدا کر دیے ہیں وہ رفیع ہوں اور جو ہدایت انھوں نے گم کر دی تھی اس سے پھر بہرہ مند ہوں۔

ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ، 'ثُمَّ' یہاں استعجاب کے مفہوم میں ہے اور فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ سے مقصود یہ ظاہر کرنا نہیں ہے کہ اہل کتاب کا ایک قلیل گروہ اس کتاب الٰہی سے منہ موڑ رہا ہے، اس لیے کہ اس جرم کے مرتکب تو اہل کتاب من حیث الجماعت ہوئے تھے، ان کے اندر سے صرف تھوڑے سے لوگ نکلے، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، جو اسلام لانے والے بنے، بلکہ اس میں اصلی زور مِنْهُمْ کے لفظ پر ہے یعنی تعجب کا اظہار اس بات پر ہے کہ یہ منہ موڑنے والا گروہ ان اہل کتاب کا ہے جو سب سے زیادہ سزاوار اس بات کے تھے کہ سب سے پہلے اس پر ایمان لانے والے بنتے لیکن وہ ایمان کی راہ میں سبقت کرنے کے بجائے کفر کی راہ میں سبقت کرنے والے بنے۔

یہود کا جماعتی مزاج

آخر میں وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ سے اہل کتاب کے اصل جماعتی مزاج پر روشنی ڈال دی کہ حق سے ان کا یہ اعراض کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے ان کی روش یہی رہی ہے۔ اس فقرے میں اہل کتاب کے لیے سخت ملامت کا پہلو بھی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی کا بھی۔ مطلب یہ ہے کہ حق سے اعراض جن کی فطرت ثانیہ اور جن کا قومی مزاج بن چکا ہو ان کے دل میں اگر حق نہیں اترتا تو اس میں قصور تمھارا یا حق کا نہیں ہے بلکہ ان کے فساد مزاج کا ہے۔ پتھر میں جونک کہاں لگی ہے!

جو لوگ بنی اسرائیل کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ سے لے کر سیدنا مسیح تک بلا استثنا ہر پیغمبر نے ان کے مزاج پر ماتم کیا ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم انبیائے بنی اسرائیل کے صحیفوں سے اس کی مثالیں پیش کرتے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۴)

یہ مضمون سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کے ہر پہلو کی وضاحت کر چکے ہیں۔ وہاں ارشاد ہوا ہے کہ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗــــَٔــتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ ۸۰-۸۱ بقرہ (اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن، ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے عہد کرا لیا ہے تو اللہ اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تمھارے پاس کوئی علم نہیں۔ اصل معاملہ تو یوں ہے کہ جس نے گناہ کی کمائی کی اور اس کے اس گناہ نے اس کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)

بقرہ میں یہ آیت بنی اسرائیل کی ان جھوٹی آرزوؤں (امانی) کے ضمن میں وارد ہے جن کو کوئی سند

یہود کی جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال

ان کے دین میں موجود نہیں تھی۔ ان کے علماء نے محض اپنے جی سے گھڑ کر ان کو اپنی شریعت کا جزو بنا دیا تھا اور دل پسند ہونے کی وجہ سے یہ بدعتیں ان کے عوام کے دلوں میں اس طرح راسخ ہوگئی تھیں کہ اب ان کا سارا تکیہ انھی جھوٹی آرزوؤں پر رہ گیا تھا۔ ازاں جملہ ان کا یہ من گھڑت عقیدہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل چونکہ برگزیدہ امت ہیں اس وجہ سے ان کے اعمال خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ان کے لیے دائمی عذاب نار نہیں ہے، اوّل تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے گئے بھی تو بس تھوڑی بہت اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر چھوٹ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ ایجاد کر لینے کے بعد دین کی اصلی ذمہ داریوں کو سوچنے سمجھنے کی ان کو کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی، پھر وہ اس قرآن کی طرف کیوں توجہ کرتے جو ان کو اس جنت الحمقاء سے نکال کر ان کو رو در رو ان کی ان ذمہ داریوں کے آگے کھڑا کرنا چاہتا تھا جو ان پر فی الواقع ان کے دین کی رو سے عاید ہوتی تھیں۔ قرآن نے واضح کیا کہ ان کا یہ عقیدہ 'افتراء علی اللہ' یعنی اللہ تعالیٰ کے اوپر ایک تہمت اور ایک بہتان ہے۔ اس نے کہیں بھی بنی اسرائیل کو یہ لائسنس نہیں دیا ہے کہ وہ جو چاہیں کرتے رہیں، بس چند دن کی سزا کے بعد وہ جنت میں پہنچ جائیں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ درحقیقت ان کی اسی قسم کی من گھڑت بدعات و خرافات ہیں جن میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے وہ اپنے دین کے معاملے میں دھوکے میں پڑے ہیں۔ اب ان کا دین ان کی چند دل پسند آرزوؤں اور ان کے چند دلفریب خوابوں کا ایک مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جن میں ان کے لیے خدا کے ہاں حقوق تو بے شمار ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر، لیکن یہ ان کے اوپر چند رسوم کے سوا کوئی ذمہ داری عاید نہیں کرتا۔

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۵)

یعنی یہ تو یہ امیدیں لگائے بیٹھے ہیں اور آخرت سے متعلق یہ لذیذ خواب دیکھ رہے ہیں لیکن اس وقت کیا بنے گا جب ہم ان کو ایک ایسے یوم الفصل کے احوال و نتائج دیکھنے کے لیے جمع کریں گے جو اس کائنات کی ایک اٹل حقیقت ہے اور جس کے پیش آنے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے؟ ہمارے نزدیک لام یہاں 'فی' کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اس کے اندر ظرفیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اور عربی زبان کے قواعد کی رو سے اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ یہاں حرف جر کے بعد ایک مضاف محذوف مان لیا جائے۔ ہم نے اسی دوسرے پہلو کو سامنے رکھ کر آیت کی وضاحت کی ہے۔

اس دن کی ایک خصوصیت تو یہ بیان ہوئی کہ اس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے، دوسری یہ کہ اس دن ہر نفس کو اس کی کمائی پوری کی جائے گی، کسی کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ اہل کتاب خود سوچ لیں کہ آج ایک من گھڑت عقیدے میں مبتلا ہو کر یہ جس خواب خوش کے مزے لے رہے ہیں اس سے بیدار ہونے کے بعد انھیں کس حقیقت سے دوچار ہونا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ

تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؀ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْـحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْـحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۶-۲۷)

امتِ مسلمہ کے لیے ایک عظیم بشارت دعا کے اسلوب میں

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے پوری امت کو ایک دعا تلقین کی گئی ہے جو مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے۔

۱۔ پہلی چیز وہ عظیم بشارت ہے جو اس امت کے لیے اس کے اندر مضمر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ دعا درپردہ اشارہ کر رہی ہے کہ اہل کتاب کی ضد اور ان کے حسد کے علی الرغم امامت و سیادت کا وہ منصب جس پر بنی اسرائیل اب تک فائز رہے ہیں اب وہ بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو رہا ہے اور بنی اسرائیل کی کوئی مخالفت خدا کے اس فیصلہ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اپنے ملک کا مالک خدا ہے، جس کو چاہے وہ ملک بخشے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلت دے، خیر کے تمام خزانوں کا مالک وہی ہے۔ بنی اسرائیل یہ جو سمجھتے رہے ہیں کہ تمام خیر کے وارث و مورث وہی ہیں، کسی اور کے لیے، خاص کر بنی اسمٰعیل کے لیے، اس خیر میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس دعا نے ان کے اس خیالِ باطل کی بساط الٹ دی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اب مالکِ کائنات نے اس خزانۂ خیر کی کنجیاں بدعہدوں اور خائنوں سے چھین کر ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو اس امانت کے اہل ہیں۔

۲۔ اس بشارت کے ساتھ اس میں بنی اسرائیل کے لیے انذار بھی ہے اور یہ انذار درحقیقت مذکورہ بالا بشارت ہی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب سیادت بنی اسمٰعیل کو حاصل ہو گی تو لازماً اس سیادت سے بنی اسرائیل محروم ہوں گے، جب بنی اسماعیل عزت سے سرفراز ہوں گے تو لازماً بنی اسرائیل کے لیے ذلت مقدور ہو چکی ہے۔ نصب و عزل، عزت و ذلت اور حیات و موت دونوں کا ذکر کر کے قرآن نے اپنے مخالفین اور موافقین دونوں کے لیے تقدیر کا فیصلہ سنا دیا۔

۳۔ اس میں اس امت کے لیے ایک عظیم نصیحت بھی ہے کہ اب یہ امانت جو تمہاری طرف منتقل ہو رہی ہے تو یہود کی طرح یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ یہ تمہارے استحقاقِ ذاتی کا کرشمہ یا تمہارے حسب و نسب کا ثمرہ ہے بلکہ یہ سرتاسر خدا کا فضل ہے جس کے تم اس وقت تک سزاوار قرار پاؤ گے جب تک اس کا حق ادا کرتے اور اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے معاملے میں برابر خدا سے دعا کرتے رہو گے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ آیت درحقیقت یہود کے عزل کا اعلان اور امتِ مسلمہ کے نصب کی بشارت ہے، لیکن بات بجائے خبر اور بشارت کے دعا کے اسلوب میں کہی گئی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان آیات کے نزول کے وقت تک حالات ابھی پردے میں تھے اور جو چیز پردے میں ہو اس کے متعلق یہی اسلوب موزوں ہے کہ امت اس کے لیے دعا کرے، اور دوسری یہ کہ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ امت اس بشارت کو فخر اور غرور کے ساتھ نہ قبول کرے بلکہ تواضع، تذلل،